جمادی الاول ۱۴۰۹ھ دسمبر۔جنوری ۱۹۸۹ء

ادبی کائنات

مکتبہ کائنات دلّی

ظلمت شام خزاں یاد کرے گی برسوں
ہم جب آئے ہیں گلستاں کنارے آئے ہیں

احتشام حسین

سید احتشام حسین رضوی ماہلی

ولادت: ۱۱ر جولائی ۱۹۱۲ء وفات: یکم دسمبر ۱۹۷۲ء

اللہ کے سہارے جس کا فیض عام اور عنایتیں خاص ہیں

علمی، فکری، دینی اور تہذیبی ماہنامہ

ادبی

کائنات

جمادی الاول ۱۴۰۹ھ / دسمبر، جنوری ۱۹۸۹ء

مدیر

عقیل الغروی

قیمت، فی پرچہ پانچ روپے　　سالانہ: پچاس روپے　　تین سال کے صرف سو روپے

مکتبۂ کائنات، سفینۃ الھدایہ ٹرسٹ

۱۴ امام باڑہ لین، رشید مارکیٹ دلّی ۵۱

ترتیب

اس شمارے کے اہلِ قلم

۱۔ مفتی جعفر حسین:

اسلامی علوم والسنہ کے جید عالم، اُردو کے زبردست ادیب، نہج البلاغہ، صحیفۂ علویہ اور صحیفۂ سجادیہ کے کامیاب مترجم اور حضرت علی ابن ابی طالب علیہ آلاف التحیۃ والثنا کے محقق سیرت نگار جن کی تصنیف "سیرتِ امیر المومنین" اُردو کے نثری، بطور خاص سوانحی ادب میں اپنے وزن کی اکیلی تصنیف ہے۔

۲۔ مجاہد حسین حسینی:

خلوص شناس، اخلاص آزما مخلص دوست — ناموسِ حرف کے شناسا شاعر، ادیب، مکتوب نگار اور روزنامچہ نویس غرضکہ قلم کے دھنی اور شاق، بہار شمی دیانند کالج پریل (بمبئی) میں اُردو اور فارسی کے معلم اور صدر شعبہ ہیں۔ آرزو لکھنوی پر پی ایچ ڈی کا مقالہ اور چند مضامین کا ایک مجموعہ "جستجو" کے نام سے چھپ کر شائع ہو چکا ہے اور سارا کچھ چھپا پڑا ہوا ہے۔

۳۔ قمر احسن:

سید محمد رضا باقر، بہاؤ الدین پور ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے مولوی صاحب قبلہ ہی نئی دلی میں مقیم اُردو کے جدید افسانہ نگار قمر احسن کے نام سے جانے جاتے ہیں اور اب تک بالکل پہچانے نہیں جاتے لیکن یہ بات شخصیت کی ہے۔ ایک صاحبِ قلم کی حیثیت سے وہ حرف حرف ناکشیدہ تحریریں چننے والے رفوگر کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔

آفاق

۱۹۸۸ء رخصت ہو رہا ہے تو جیسے دونوں وقت ملنے کا سماں ہو، مجھے آفاق پر بالکل ایسا ہی جھٹپٹا سا نظر آرہا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ میری بے بصری کا کرشمہ ہو، اور جنہیں وقت کی نیرنگیاں دکھائی دیتی ہیں وہ اُن کی پُر بصری کا جلوہ ——— لیکن بصیرت تو کچھ اور ہی نقوش ابھارتی ہے۔

ممکن ہے کہ اس جھٹپٹے کا دھندلکا گہرا ہوتا چلا جائے اور تاریکی ہی چھا جائے یا اُس کا آفتابی پَرتَو اور نکھرتا چلا جائے تو صحنِ عالم رَوشن ہی ہو جائے۔

اور کاش کہ ایسا ہی ہو۔

ہمارے ملک اور ہماری زبان کے بزرگ اور معتبر صحافی عشرت علی صدیقی نے تو ۱۹۸۸ء کو "امن و مفاہمت کا سال" قرار دیتے ہوئے بہت ہمت بندھائی ہے!

ہندوستانیوں کے لیے ۱۹۸۸ء آزاد اور نہرو کا سال ہے لیکن بین الاقوامی تعلیمی اور ثقافتی تنظیم یونیسکو UNESCO نے اس کو "سال حافظ" قرار دیا ہے۔

خواجہ شمس الدین محمد حافظ جس کو دُنیا ایک فارسی زبان کے ایرانی شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے، تخلص ہی کی حد تک حافظ نہیں تھا۔ وہ واقعتہً حافظ تھا اور ہر اعتبار سے "حافظ"۔

اس نے منگولوں کے آخری دَور سے لیکر تیموری دَور کے شروع تک کا پُر شورش و پُر شور زمانہ پایا، لیکن اسی بے ہنگام سازِ وقت پر اپنا ہمیشہ کے لیے "محفوظ" رہ جانے والا آہنگ چھیڑا۔

نفس باد صبا مشک فشاں خواہد شد
عالم پیر دگر بارہ جواں خواہد شد

اس نے اپنی شخصیت، اپنے دل و دماغ اور اپنی توانائیوں کی حفاظت کی، چودہ روایتوں سے قرآنِ کریم حفظ کیا اور پھر بہ قدر پیمانۂ تخیل کتنے ہی رموزِ انفس و آفاق دیوانِ شاعری میں محفوظ کیے تب حافظ کہلایا!

دوش دیدم کہ ملایک درِ میخانہ زدند
گلِ آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند
آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

اگر کوئی واقعۃً حافظ ہو تو کیا یہ شعر پڑھتے وقت فوراً قرآنِ کریم کی یہ آیت اس کے سامنے نہ آجائے گی۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝

(قرآنِ کریم / سورۃ الاحزاب / ۷۲)

حافظ کی فکری رفتار اور فنی روش کو اگر کوئی نام دینا چاہیں تو وہ "سلامت روی" ہے۔ لیکن —— یہ "سلامت روی" اپنے اردو میں مستعمل معنی اور سیاق و سباق کے ساتھ نہیں بلکہ اس میں ذرا سی معنوی وسعت اور حافظ کے اپنے سیاق و سباق میں! یعنی جس رفتار و روش نے اُس کو "ہر اعتبار سے حافظ بنایا" —— بطورِ مثال اس کی اس رفتار و روش کا ایک نمایاں پہلو جس کی طرف ہمارے ڈاکٹر امرت لال عشرت کی نظر بھی پہنچ گئی ہے کہ "خوفناک جنگوں اور طرب ناک محفلوں کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن خواجہ حافظ کے کلام پر ان عارضی غموں اور وقتی خوشیوں کی چھاپ بہت کم دکھائی دیتی ہے ..... ان کے تصور کی آنکھ نے اِن سطحی واقعات اور انفرادی زندگی کے نشیب و فراز کی بجائے پوری انسانی زندگی اور اس کی ... دائمی اقدار کو پیشِ نظر رکھا" ——

اور غالباً یہی وہ چیز تھی جس نے دیوانِ آفاق میں کلامِ حافظ کو لازوال اہمیت بخشی!

عقیل الغروی

پروفیسر احتشام حسین مرحوم

رُباعیات

ابھی الہ آباد میں پروفیسر احتشام حسین مرحوم کی برسی منائی جارہی ہے۔ ہم نے "ادبی کائنات" کے اگست ستمبر ۸۸ء کے شمارے میں مرحوم کی ایک نادر تحریر "جلاوطن اسلام" شائع کی تھی۔ اور اس شمارے میں اُن کی چند رُباعیاں ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی کے مقالے ..... "کچھ یادیں کچھ غم" کے ساتھ ہدیۂ ناظرین ہیں۔ یہ رُباعیاں لکھنؤ کے ماہنامہ جریدہ الواعظ کے ایک پرانے شمارے سے ماخوذ ہیں جب پروفیسر احتشام حسین صرف "سید احتشام حسین رضوی ہلی بی۔ اے" لکھے جاتے تھے۔ ادارہ

رُباعی

دُنیا کو غلامی سے چھڑانے آیا
قرآن سا پیغام سُنانے آیا
احمد جسے کہتے ہیں نبیِ آخر
اِنسان کو انسان بنانے آیا

رُباعی

نکلا نہ کوئی بھی راز دانِ ہستی
سُنتے آئے ہیں داستانِ ہستی
اے رحمتِ حق! باعثِ ایجادِ جہاں
بعثت نے تری بڑھائی شانِ ہستی

ثمر ہلوری

آفاق (ایک تجزیہ)

(ماہنامہ "ادبی کائنات" کے اداریوں سے متاثر ہو کر)

اک نور اک آواز کا اعجاز ہے آفاق
ہر چند نمایاں ہے مگر راز ہے آفاق

النور من النور الی النور علی النور
آواز در آواز در آواز ہے آفاق

کہسار بپا نخل بدست ارض بہ سینہ
دریا بجبیں جلوہ گہہ ناز ہے آفاق

تجرید بدامن ہے تکثر بگریباں
ظلمت کدۂ زلفِ سرافراز ہے آفاق

صحرا بہ تخیل چمنستاں بہ تماشہ
پنہائی و پیدائیِ انداز ہے آفاق

گلشن برخ و حسن بہ تن نور بچہرہ
رمزِ نگہہ شاہد گلباز ہے آفاق

اوڑھے ہوئے ذرات کی چادر سی بسر عت
لمحوں کے سمندر میں قدم باز ہے آفاق

شیرینیِ اصوات و سکوت متبسم
کیونکر کہوں آواز ہے یا ساز ہے آفاق

اِن آنکھوں کو یارا ہے تماشہ نہیں ورنہ
آفاق در آفاق بصد راز ہے آفاق

جوہر بعرض گہہ عرض انداز بجوہر
پھر کیسے جہاں سوز و جہاں ساز ہے آفاق

درصورت تفصیل ہے پہنائی کونین
ہر آدمی درصورت ایجاز ہے آفاق

اثرِ خامہ علامہ مفتی جعفر حسین طاب ثراہ

صحیفۂ کاملہ — ایک تناظر

"صحیفۂ کاملہ" اسلام کے ابتدائی دورِ تدوین و تالیف کی ایک الہامی تصنیف ہے جو حضرت امام زین العابدین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دُعاؤں اور مناجاتوں پر مشتمل ہے۔ اس کی عظمت و اہمیت اور اعتماد و وثوق کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ حضرتؑ نے خود اس کی ترتیب و تدوین کا اہتمام فرمایا اور اپنے دونوں صاحبزادوں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور جناب زید شہید رحمتہ اللہ علیہ سے جبکہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام بھی اس موقع پر موجود تھے اسے قلمبند کروایا تاکہ اس کے ضبط و حفظ کا سامان مکمل ہو جائے اور اس کے ذریعہ تعلیم و ہدایت کا سلسلہ جاری رہے۔ چنانچہ امام محمد باقر علیہ السلام نے اپنا تحریر کردہ صحیفہ امام جعفر صادقؑ کے سپرد فرمایا' اور آپ نے وہ دُعائیں متوکل ابن ہارون کو لکھوا دیں۔ اور جناب زید کا نسخہ ان کے فرزند یحییٰ کی طرف منتقل ہوا اور ان سے محمد ابن عبداللہ ابنِ حسن مثنیٰ اور ان کے بھائی ابراہیم کے ہاتھوں میں پہنچا اور اس طرح حفظ و سماعت اور نقل و کتابت کے ذریعہ منتقل ہوتا ہوا دُنیائے اسلام میں پھیل گیا۔ اور ہر دور میں قبولیت عامہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور پرستارانِ حقیقت و حلقہ بگوشانِ امامت نے اسے آویزۂ گوش عقیدت بنایا اور قرآنِ مجید کی تلاوت کے ساتھ ساتھ اس کا ورد بھی اپنے معمول میں سے قرار دے لیا اور چھٹی صدی ہجری کے نصفِ اول میں اسے زبورِ آلِ محمد و انجیلِ اہلبیتؑ کے ناموں سے یاد کیا جانے لگا۔ یہ نام اس لحاظ سے تجویز کیے گئے کہ اس کے حکیمانہ ارشادات و بصائر مؤثر ادعیہ و اوراد اور دلنشیں حکم و نصائح آسمانی صحیفوں کے اسلوب کے آئینہ دار اور ان کی تعلیمی رُوح کے حامل ہیں۔ چنانچہ صاحبِ ریاض السالکین نے بعض اہلِ عرفان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

انها تجری مجری التنزیلات السماویة وتسیر مسیر الصحف اللوحیة والعرشیة۔

صحیفہ کاملہ آسمانی کتابوں کے اسلوب اور عرش و لوح کے صحیفوں کی روش کا مکمل نمونہ ہے۔

اور دوسرے یہ کہ اس صحیفہ کی نسبت امام زین العابدینؑ کی طرف اسی طرح شک و شبہ سے بالاتر ہے جس طرح زبور کی نسبت حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف اور انجیل کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف ہر قسم کے شبہ سے بالاتر ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر بعد میں جتنی کتابیں تالیف ہوئیں ان کے مآخذین [illegible] مجموعوں میں دعائے علی ابن الحسینؑ کے عنوان

سے اس مجموعہ کی دعاؤں کو نقل کرتے رہے اور ان میں سے کسی ایک نے بھی اس کی صحت نسبت کے متعلق کسی خدشہ کا اظہار نہیں کیا اور بغیر کسی پس و پیش کے اسے کلام امام تسلیم کیا ہے۔ اگر انھیں اس کے کسی پہلو پر کمزوری و خامی کا شائبہ نظر آتا تو وہ خاموشی کو اصول دیانت کے خلاف سمجھتے ہوئے اس کے خلاف آواز بلند کرتے اور اپنے شبہات کا اظہار کرتے مگر کسی ایک نے بھی ایسا نہیں کیا جس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان سب کے نزدیک یہ کلام امام ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہر کلام کے کچھ خصوصیات ہوتے ہیں جن سے انتساب کے سلسلہ میں بڑی حد تک مدد لی جا سکتی ہے۔ اور لب و لہجہ و اسلوب بیان کو دیکھ کر متکلم کو پہچانا جا سکتا ہے۔ جب کلام متکلم کا آئینہ بردار ہوتا ہے تو صحیفہ کے الفاظ کا حسن، معنی کی کشش اور کلام کی دل آویزی اس امر کی دلیل ہے کہ ان کے غیر کی طرف اس کی نسبت دی ہی نہیں جا سکتی۔ کیونکہ اس کے ایک ایک جملہ کی ساحرانہ بلاغت اور ایک ایک فقرہ کی معجزانہ فصاحت اس کی شاہد ہے کہ اس کا سرچشمہ وہی دودمانِ رسالت ہے جس کا کلام فوق البشر تسلیم کیا جا چکا ہے۔ صحیفۂ کاملہ اگر ایک طرف آلِ محمد علیہم السلام کی فصاحت و بلاغت کا آئینہ دار ہے تو دوسری طرف ان کے خصوصیات و ذاتی کمالات کا بھی ترجمان ہے۔ چنانچہ ان کے صفحات پر ان کی حیاتِ طیبہ کے نقوش کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ سیاسی مصالح نے دنیا کو ان سے پوری طرح روشناس نہ ہونے دیا اور ان کی علمی و عملی رفعت پر تعصب و تنگ نظری نے پردے ڈال دیئے مگر ان کے اقوال وارشادات وہ ہیں جو ان کی عملی زندگی کی پاکیزگی اور ان کی علمی وسعت و بلند پایگی کی روشن دلیل ہیں۔ چنانچہ اس صحیفہ میں دعاؤں کے ضمن میں علم الٰہیات، فلکیات، اور عصری انکشافات کی طرف جو اشارے کئے گئے ہیں وہ ان کی وسیع النظری اور علمی ہمہ گیری کی وہ واضح برہان ہیں جسے عصبیت کا غبار چھپا نہیں سکتا۔

صحیفہ اور طرزِ نگارش

دورِ جاہلیت اور اوائلِ اسلام کے طرزِ تحریر و اندازِ نگارش کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس دور کا ادب دقیق اور بھاری بھرکم الفاظ پر مشتمل ہوتا تھا اور تشبیہہ و استعارہ اور ترصیع و تجنیس وغیرہ سے کلام میں حسن و دل آویزی پیدا کی جاتی تھی مگر آلِ محمد نے جس کی امتیازی مثال صحیفۂ کاملہ میں نظر آتی ہے، کلام میں سلاست و روانی سے کام لے کر سلیس و سادہ انشاء پردازی کی بنیاد رکھی اور طرزِ نگارش کو ایک نیا اسلوب بخش کر اہلِ قلم کو اس کے تتبع کی دعوت دی اور سجع و ترصیع کی بندشوں کو توڑ کر تادیہ و تعبیر کی وسعتیں بڑھا دیں اور ہلکے پھلکے الفاظ کی وہ بستیاں آباد کیں جن کے سامنے مقفّیٰ و مسجع عبارتوں کے مزیّن کاشانے ویران ہو گئے اور سیدھی سادی لفظوں اور سادہ و دل نشین ترکیبوں میں وہ کیف بھر دیا کہ تجنیس و ترصیع کا مصنوعی حسن اس کی قدرتی و فطری سادگی کے آگے ماند پڑ گیا۔ اور اصل جوہر فصاحت یہی ہے کہ موضوع کلام کچھ بھی ہو، زبان کی روانی اور کلام کی سلاست میں لوچ نہ آئے اور الفاظ اپنی جزالت اور سحر آفرینی سے دل کی

گہرائیوں میں اُترتے چلے جائیں۔ اس سہل اور دل نشین طرزِ تحریر کا اصل محرک دُعا و مناجات کے کلمات تلفظ و ادائگی اور صوتی کیفیت میں رِقّت و نرمی اور سوز و گداز کے مقتضی ہوتے ہیں اور ان میں ربط و ترتیب اور حسن آفرینی مقصود نہیں ہوتی کہ کلام کے خد و خال کو نکھارا اور اس کے نوک پلک کو سنوارا جائے اور اندوہ و غم کے تاثرات اور رنج و الم کے جذبات میں اس کا موقع ہی کہاں ہوتا ہے کہ جملوں کی ساخت اور لفظوں کی تراش خراش کی طرف توجہ کی جا سکے۔ چنانچہ یہ صحیفہ اوّل سے لیکر آخر تک درد و غم کی آہوں اور کرب و اضطراب کی صداؤں پر مشتمل ہے جس میں کچھ دُعائیں ہیں اور کچھ مناجاتیں جن میں نہ تصنّع کا شائبہ ہے نہ آورد کی جھلک نہ فلسفیانہ اُلجھاؤ ہیں نہ منطقیانہ پیچ و خم بلکہ ہر مقام پر وہی سیدھا سادہ اندازِ بیان ہے جو ایک دُعا کا ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر حضرت کے دُعا کے اس جز کو دیکھئے کہ اس میں تضرع و الحاح کے ساتھ کتنی آمد، بے تکلفی اور سلاست کارفرما ہے۔

سبحانك نحن المضطرون الذين اوجبت اجابتهم و اهل السوء الذين وعدت الكشف عنهم و اشبه الاشياء بمشيتك واولى الامور بك فى عظمتك رحمة من استرحمك وغوث من استغاثك، فارحم تضرعنا واغننا اذطرحنا انفسنا بين يديك۔ (طالب پناہ کے سلسلہ میں)

پاک ہے تو۔ ہم وہ پریشان و لاچار ہیں جن کی دُعا کو قبول کرنا تو نے ضروری قرار دیا ہے اور وہ گرفتارانِ بلا ہیں جن کی مصیبتوں کو دور کرنے کا تو نے وعدہ کیا ہے تیری مشیئت کے نہایت مناسب اور تیری عظمت کے بہت شایان یہ ہے کہ جو تجھ سے رحم کی التجا کرے اس پر تو رحم کرے اور جو تجھ سے فریاد کرے اس کی فریاد کو پہنچے تو اب ہماری عجز و زاری پر رحم فرما اور جبکہ ہم نے اپنے کو تیرے سامنے پیش کر دیا ہے تو ہمیں ہر فکر و غم سے بے نیاز کر دے۔

صحیفہ اور اسلوب خطاب

اللہ کو پکارنے اور خطاب کرنے کے لئے الفاظ کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں ہے کیونکہ اسے گنے چنے ناموں اور مخصوص صفتوں ہی سے یاد کیا جا سکتا ہے اور ہر وہ لفظ جو کسی بلند صفت کا پتہ دیتی ہو ضروری نہیں کہ اس کا اطلاق اللہ کی ذات پر درست ہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی شانِ علو و عظمت کے منافی ہو۔ جیسے عارف، عاقل، ذکی وغیرہ اس ہی طرح عربوں کے بعض دُعائیہ کلمات میں جو اس قسم کے الفاظ پائے جاتے ہیں انھیں اللہ کی رفعت و عظمت کے لحاظ سے موزوں نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ جیسے "یا ابا المکارم" اے بزرگیوں کے باپ، اب کے لغوی معنی باپ کے ہیں اور یہ اس کے ساحت قدس کے لئے زیبا نہیں ہے۔ اگرچہ یہاں پر اس کے معنی 'والے' کے ہیں اسی طرح "یا ابیض الوجہ" اے روشن چہرے والے، اگرچہ وجہ انتساب کسی معنیٰ سے اس کی طرف ہوا ہے۔ جیسے فاینما تولوا فثم وجہ اللہ۔

تم جدھر بھی رُخ کروگے اُدھر اللہ ہی اللہ ہے۔ مگر اسے اور اس جیسے دوسرے الفاظ کو جن کا اطلاق مجازاً اس کی ذات پر ہوا ہے ایسے اضافہ کے ساتھ استعمال کرنا جو دوسروں ہی کے لئے بولے جاتے ہیں، قدرت کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ اگرچہ کہنے والے کی اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی ذات ہر نقص و عیب سے بری ہے۔ اسی طرح "یا عریض الجفنۃ"۔ اے بڑے پیالے والے۔ اس سے استعارۃً کریم و سخی مراد لیا جاتا ہے۔ کیونکہ بڑے پیالے اسی کے یہاں ہوں گے جس کے یہاں مہمانوں کا ہجوم رہتا ہو۔ مگر اللہ کے جود و کرم کی وسعتوں اور خوانِ کرم کی پہنائیوں کا اندازہ پیالوں اور پیمانوں سے نہیں لگایا جاسکتا کہ اس قسم کے استعارہ کو اس کے لئے مناسب و موزوں سمجھا جائے۔ اس کے مقابلہ میں صحیفہ کی دعاؤں کے الفاظِ نِدا اللہ کی عظمت و تقدیس کے آئینہ دار ہیں کہ نہ کوئی کلمہ اس کے ساحتِ جلال کے منافی اور نہ کوئی جملہ اس کی شانِ رفعت کے خلاف نظر آتا ہے بلکہ ہر کلمہ اس کے اوصافِ حسن و کمال کا ترجمان اور ہر جملہ اس کی شانِ تنزیہ و تقدیس کا حامل ہے چنانچہ دعا و طلبگاری کے سلسلہ میں چند متفرق الفاظ ندا کو دیکھئے کہ امام علیہ السلام کس اسلوب اور کس لب و لہجہ میں اسے والہانہ انداز سے پکارتے ہیں کہ معانی کا حسن قلب و روح کو جذب کرتا اور الفاظ کا ترنم نغمۂ شیریں کی طرح کانوں میں گونجتا معلوم ہوتا ہے۔

انت الکریم المتکرم انت الکریم الاکرم انت الجواد الکریم یا ولی الاحسان یا رحمن الدنیا والاخرۃ یا منتھی مطلب الحاجات ویا من عندہ نیل الطلبات انک ذو الفضل العظیم والمن القدیم انک المتفضل بالاحسان المتطول بالامتنان انک ذو الجلال والاکرام۔

تو کرم و بخشش کرنے والا اور ہر عیب سے پاک ہے، تو جود و سخا کرنے والا اور بزرگ و برتر ہے۔ تو سخی و کریم ہے اے احسان کرنے والے۔ اے وہ ذات جو حاجت طلبی کی آخری منزل ہے اور اے وہ ذات جس سے مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ بے شک تو بڑے فضل والا اور قدیم احسان والا ہے اور تو بہت زیادہ احسان کرنے والا اور اپنے لطف و کرم سے بہت بخشنے والا ہے۔ بے شک تو بزرگی اور اعزاز والا ہے۔

صحیفہ اور دعائی تعلیم

صحیفہ کی دعاؤں نے جہاں دعا کی عظمت و اہمیت سے دنیا کو آشنا کیا ہے وہاں دعا کا طریقہ بھی تلقین کیا ہے کہ طلب و سوال کے موقع پر کیا انداز اختیار کرنا چاہئے اور کس نہج اور کس اسلوب سے دعا مانگنا چاہئے۔ مثلاً بیمار ہو تو طلب شفاء کے لئے کس طرح دعا مانگے، قرض سے سبکدوشی کے لئے کس طرح التجا کرے۔ مقصد و حاجت کے سلسلہ میں کیا اسلوب اختیار کرے۔ توبہ و استغفار کے لئے کس طرح اس کے سامنے گڑگڑائے۔ مصائب و آلام سے رہائی کے لئے کس طرح اسے پکارے۔ چنانچہ ابنِ جوزی سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ:۔

ان علی ابن الحسین زین العابدین لہ حق التعلیم
فی الاملاء والانشاء وکیفیۃ المکالمۃ والمخاطبۃ
وعرض الحوائج الی اللہ تعالیٰ فانہ لولاہ لم
یعلم المسلمون کیف یتکلمون ویتفوھون سبحانہ
فی حوائجھم فان ھذا الامام علمھم بانہ متی ما
استغفرت فقل کذا ومتی استسقیت فقل کذا ومتی ما
خفت من عدو قل کذا۔

حضرت زین العابدین علی ابن الحسین انشاء و تحریر اور اللہ
سبحانہٗ سے تکلم وخطاب اور اس کے حضور عرض حاجات
کے سلسلہ میں مسلمانوں پر حق تعلیم و استادی رکھتے ہیں۔
اس لئے کہ اگر حضرت نہ ہوتے تو مسلمان یہ نہ جانتے کہ وہ
اللہ سبحانہٗ سے کس طرح خطاب کریں اور کس طرح اس سے
اپنی حاجتیں طلب کریں اور یہ حضرت ہی نے مسلمانوں
کو سکھایا ہے کہ اگر توبہ کرو تو یہ کہو اور طلب باراں ہو تو
یہ کہو اور دشمن کا خطرہ ہو تو یہ کہو۔

(مقدمہ صحیفہ، آیۃ اللہ سید شہاب الدین مرعشی)

اس کے علاوہ یہ تعلیم بھی ملتی ہے کہ کن کن اوقات میں دعا مانگے کہ قبولیت اس کے خیر مقدم کے لئے بڑھے
چنانچہ صحیفہ کی وہ دعائیں جو مخصوص اوقات و ایام سے وابستہ ہیں وہ ان کے اوقات قبولیت و استجابت
ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔ جیسے دعائے روزِ عرفہ، دعائے نمازِ شب، دعائے روز جمعہ وغیرہ۔ ان دعاؤں میں جہاں
قبولیت کے اوقات کا لحاظ رکھا گیا ہے وہاں انسان کے عمومی اوقاتِ فراغت کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔
جیسے صبح و شام، دوپہر اور شب کے اوقات کہ جن میں بندہ یکسوئی سے اپنے معبود سے راز و نیاز اور عرض التجا
کر سکتا ہے اور اگر ایسا ہو کہ ان معینہ اوقات میں طبیعت دعا کی طرف مائل نہ ہو یا دل و دماغ میں یکسوئی پیدا
نہ ہو سکے تو صحیفہ میں ایسی دعائیں بھی ہیں جو کسی وقت اور زمانہ سے مقید نہیں ہیں تاکہ انسان اوقات و ساعات
سے بے نیاز ہو کر جب بھی اس سے لو لگانا چاہے اس کے پاس لو لگانے کا سر و سامان موجود ہو اور جس مقصد کے
لئے اسے پکارنا چاہے پکار سکے۔ چنانچہ ان دعاؤں میں ہر مقصد و حاجت کی دعا موجود ہے اور ہر درد کا درماں
ہر دکھ کا علاج، ہر اضطراب کی تسلی اور ہر مصیبت و اندوہ کا مداوا پایا جاتا ہے۔ وہ کون سی مشکل ہے جس کی یہ
سپر نہ ہوں اور وہ کون سی مصیبت ہے جس کے دور کرنے کا سامان ان میں موجود نہ ہو۔ وہ دشمن کا خطرہ ہو یا غنیم کا
کھٹکا، قرض کی گرانباری یا رزق کی تنگی، غموں کی فراوانی ہو یا بلاؤں کا ہجوم، درد و الم کی طوفان انگیزی یا شدتِ مرض
کی جانکاہی، افکار دنیا کی کشمکش ہو یا روز آخرت کا دھڑکا سب کی چارہ سازیوں کا سر و سامان ان میں موجود ہے
اب اس دولت فراواں کے ہوتے ہوئے کوئی اپنی بے چارگی و بے نوائی کا علاج نہ کرے تو خود اپنے لئے افلاس
و نکبت کو دعوت دے رہا ہے۔ یہ دستِ کریم کی بخیلی نہیں بلکہ طلب کرنے والے کی کوتاہی و سہل انگاری ہے ع

گر گدا کاہل بود تقصیرِ صاحب خانہ چیست

خوف و رجاء کی تلقین

عبودیت کی تکمیل کے لئے خوف و رجاء کے ملے جُلے جذبات کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ خوف و رجا سے فکر و اعتقاد میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور یہی پختگی عمل کی تحریک کرتی ہے اور نتیجہ میں انسان اپنی اعتقادی و عملی زندگی کو سنوار لے جاتا ہے چنانچہ اُمید و رجا سے وابستگی ہوگی تو طلب و سعی میں سرگرمی پیدا ہو جائیگی اور وہ کسی حالت میں بھی عمل و اطاعت سے جی نہیں چرائے گا۔ اور اُمید کے سہارے پر قدم آگے بڑھاتا چلا جائے گا۔ اور یہ اُمید و رجا ہی کا کرشمہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جو کلفتیں اور اذیتیں اسے پیش آتی ہیں انھیں خندہ پیشانی سے جھیل لے جاتا ہے اور کسی موقع پر زبان کو شکوہ و شکایت سے آلودہ نہیں ہونے دیتا۔ اور دل میں خوف بسا ہوا ہوگا تو وہ انجامِ کار کی کامیابی سے مطمئن ہو کر غفلت میں نہیں پڑے گا اور محاسبہ کے ڈر سے گناہوں کے خارزار میں پھاندنے سے جھجکے اور برائیوں کے بھنور میں اُترنے سے ڈرے گا کیونکہ خوف طبعاً محرمات سے عناں گیر، اور نشۂ باطل کی فریب خوردگی سے مانع ہوتا ہے اور اسے اپنے کسی عمل پر نازاں و مغرور نہیں ہونے دیتا چاہے وہ عمل کتنا بلند، پاکیزہ اور خلوص کا حامل ہو۔ چہ جائیکہ پُر فریب طفل تسلیوں سے نفس کو دھوکا دے اور اپنے کو عقبیٰ کی باز پُرس سے بالاتر سمجھ لے۔ مگر یہ نتائج و اثرات اس صورت میں مُرتب ہو سکتے ہیں جب ان دونوں حالتوں میں توازن و اعتدال کار فرما ہو اور امید و رحمت کے احساس کے ساتھ قہر و غضب کا تصور اور قہر و غضب کے احساس کے ساتھ لطف و رافت کا تصور بھی قائم ہو۔ اور اگر صرف اُمید ہی لگائے رہے تو وہ خوشیوں کے ایسے خواب دیکھا کیے جاتا ہے جو کبھی پورے نہیں ہوتے اور آخر اسے نقصان و ہلاکت ابدی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے۔

فلا یامن مکر اللہ الا القوم الخاسرون۔　　اللہ کے عذاب سے صرف گھاٹا اُٹھانے والے ہی مطمئن ہوتے ہیں۔

اور اگر دل و دماغ پر خوف چھایا رہے تو وہ اپنے لئے خوشگوار مستقبل کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور یاس و نامرادی کی ایسی گہرائیوں میں جا پڑتا ہے جہاں سے کوئی ہاتھ اسے سہارا دے کر اُبھار نہیں سکتا۔ اور نتیجہ میں یقین کی روح پژمُردہ اور ایمان کا سوتا خشک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہے۔

ولا ییئاس من روح اللہ الا القوم الکافرون۔　　اللہ کی رحمت و بخشش سے صرف کافر ہی مایوس ہوتے ہیں۔

اور اگر ان دونوں متضاد سمتوں میں درمیانی راہ پیدا کرلے اس طرح کہ کسی سمت سے بے تعلق نہ ہونے پائے تو نہ اُمید کی فتح مندیاں اسے مغرور بنا سکیں گی اور نہ یاس کی نا اُمیدیاں اسے بھیانک اندھیروں میں بھٹکنے دیں گی۔ بلکہ زندگی کے تمام گوشے تقویٰ و عبودیت کی تابندگیوں سے روشن و منور ہو جائیں گے اور اُمید و بیم کے سایہ میں

حسنِ عمل کا کارواں کامیابی کے ساتھ منزلِ مقصود کی طرف بڑھتا رہے گا۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:۔

انهم کانوا یسارعون فی الخیرات ویدعوننا رغبا ورهبا وکانوا لنا خاشعین۔

وہ لوگ نیکیوں کی طرف تیزی سے بڑھتے تھے اور ہمارے فضل وکرم سے اُمید لگائے اور ہمارے عذاب سے ڈرتے ہوئے دُعائیں مانگتے تھے اور ہمارے سامنے سرِ نیاز جھکائے ہوئے تھے۔

اُمید وبیم کے سلسلہ میں یہودی ومسیحی نظریات اسلام کے نظریہ اعتدال کے خلاف ہیں۔ چنانچہ یہودیوں نے خدا کو قہر وغضب کا ایک مرقع بنا کر پیش کیا اس کے یہاں رحمت ورافت اور عفو ودرگذر کی اگر گنجائش ہے تو بہت ہی کم۔ اور عیسائیوں نے قہر وغضب کے مقابلہ میں لطف ورحمت کے عناصر اتنے بڑھا دیئے کہ مکافاتِ عمل سے مطمئن ہوگئے۔ مگر اسلام نے ان دونوں کے درمیان ایک متوازن سطح قائم کی اور رحمت کے ساتھ عدالت اور عدالت کے ساتھ لطف ورحمت کا تصور بھی برقرار رکھا تاکہ رحمت کا تصور انجام کار کی کامیابی سے مایوس نہ ہونے دے۔ اور عدالت کا عقیدہ اس کے احکام کی بجا آوری سے غفلت میں نہ ڈال دے۔ چنانچہ امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد ہے:۔

انه لیس من عبد مومن الا وفی قلبه نوران نور خیفة ونور رجاء لو وزن هذا لم یزد علی هذا۔

ہر مومن کے دل میں دو نور ہوتے ہیں۔ ایک نور خوف اور ایک نور رجاء۔ اس طرح کہ اگر دونوں کو وزن کیا جائے تو دونوں ترازو کے تول برابر اتریں گے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ خوف ورجا کو کس طرح نقطہ اعتدال پر لایا جا سکتا ہے اور کیونکر ان کی شدت کو کم کر کے ان میں ایک متوازن حالت پیدا کی جا سکتی ہے۔ تو یہ خوف ورجاء کے محرکات وعوامل سے وابستہ ہے اور اس سلسلہ میں صحیفۂ کاملہ کی دُعائیں اپنی اثر اندازی کے لحاظ سے انفرادی حیثیت کی حامل ہیں۔ چنانچہ صحیفہ کی جس دُعا پر نظر کی جائے، ہر دُعا میں خوف ورجاء کے دواعی واسباب دوش بدوش نظر آئیں گے جن سے خوف کی پژمردگی کے ساتھ اُمید کی ترو تازگی اور عفو ورحمت کی توقع کے ساتھ خوف وہراس کی دھڑکن بھی برقرار رہتی ہے۔ وہ خوف و رجاء کے محرکات کیا ہیں۔ ذیل میں ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اور صحیفہ میں سے ایک آدھ دُعا کا جُز بھی بطور نمونہ واستشہاد درج کیا جاتا ہے تاکہ یہ امر واضح ہو سکے کہ یہ دُعائیں ان صفات کے پیدا کرنے میں کس حد تک کامیاب ہیں اور کس موثر پیرایہ سے ہیبت وجبروت الٰہی ورحمت ورافت خداوندی کو نگاہوں کے سامنے پیش کرتی اور روح کو خوف ورجاء کے جذبات سے متاثر کرتی ہیں۔

دواعی خوف

پہلا داعی یہ ہے کہ انسان ان گناہوں کو یاد کرے جن کا مرتکب ہوتا رہا ہے اور ان حقوق کا خیال کرے جن سے عہدہ برآ ہونے کی اب کوئی صورت باقی نہیں رہی کیونکہ وہ افراد دنیا میں موجود ہی

نہیں ہیں جن کے حقوق اس کے ذمہ تھے کہ وہ ان کا تدارک کر سکے یا ان سے عفو و درگذر کی درخواست کر سکے۔ تو اب اللہ کے گناہوں سے توبہ کر بھی لے، تو لوگوں کے حقوق و مظالم سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کیا سبیل کر سکتا ہے۔ امام علیہ السلام اس داعیٔ خوف کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

اللّھم وعلیّ تبعات قد حفظتھن وتبعات قد نسیتھن وکلھن بعینک التی لا تنام وعلمک الذی لا ینسیٰ فعوض عنھا اھلھا واحطط عنّی وزرھا وخفف عنّی ثقلھا واعصمنی من ان اقارف مثلھا

اے اللہ میرے ذمہ کتنے ایسے حقوق ہیں جو مجھے یاد ہیں اور کتنے ایسے مظلمے ہیں جو مجھے بھول چکے ہیں لیکن وہ سب کے سب تیری ان آنکھوں کے سامنے ہیں جو خواب آلودہ نہیں ہوتیں اور تیرے اس علم میں ہیں جس میں فروگذاشت نہیں ہوتی لہٰذا جن لوگوں کا مجھ پر کوئی حق ہے اس کا انھیں ایسا عوض دے کر اس کا بوجھ مجھ سے برطرف اور اس کا بار ہلکا کر دے اور مجھے پھر ویسے گناہوں کے ارتکاب سے بچائے رکھ۔

دوسرا داعی یہ ہے کہ اللہ نے اپنے قہر و غضب سے گنہگاروں اور مجرموں کے لئے جو سزا و عقوبت تجویز کی ہے اس کی شدت و سختی کا تصور کرے، اور جہنم کے ان بھڑکتے ہوئے شعلوں کا نقشہ اپنی آنکھوں کے سامنے جمائے کہ جن میں وہ ایندھن کی طرح جلتا ہوگا اور ہر طرف سے سانپ بچھو منہ کھولے ہوئے اس پر حملہ آور ہوں گے۔ اور وہاں نہ کوئی فریاد سننے والا ہوگا اور نہ کوئی اس عذاب سے بچانے والا ہوگا چنانچہ امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

اعوذ بک من عقاربھا الفاغرة افواھھا وحیاتھا الصالقة بانیابھا وشرابھا یقطع امعاء وافئدة سکانھا وینزع قلوبھم۔

اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں جہنم کے ان بچھوؤں سے جن کے منہ کھلے ہوں گے اور ان سانپوں سے جو دانتوں کو پیس پیس کر پھنکار رہے ہوں گے اور اس کے کھولتے ہوئے پانی سے جو انتڑیوں اور دلوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا اور (سینوں کو چیر کر) دلوں کو نکال لے گا۔

تیسرا داعی یہ ہے کہ اس امر پر غور کرے کہ جب وہ گرم ہوا کے جھونکوں سے پریشان ہو جاتا ہے اور مچھر ایسے معمولی جانوروں کے کاٹنے سے چیخ اٹھتا ہے تو جب جہنم کے شعلے اس کی طرف لپکیں گے اور سانپ اور بچھو اسے لپٹیں گے تو کیا وہ قہر الٰہی کی بھڑکائی ہوئی آگ کی تپش اور زہریلے جانوروں کے حملہ کو سہہ لے گا۔ اور وہاں کے قسم قسم کے عذابوں کو برداشت کر لے گا۔ بھلا یہ کہاں ممکن ہے۔ چنانچہ امام علیہ السلام جہنم کے عذاب کے مقابلہ میں اپنی بے بسی و لاچاری کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:

ھٰذہٖ النفس الجزوعة وھٰذہ الرمة الھلوعة التی لا تستطیع حر شمسک فکیف تستطیع حر نارک التی لا تستطیع صوت

یہ میرا بیتاب نفس اور بے قرار ہڈیوں کا ڈھانچہ جو سورج کی تپش کو بھی برداشت نہیں کر سکتا تیری جہنم کی تیزی کو کیسے برداشت کرے گا اور جو تیرے بادل کی گرج سے

رعد ک کیف تستطیع صوت غضبک ۔ کانپ اٹھتا ہے وہ تیرے غضب کی آواز کو کیسے سن سکتا ہے ۔

چوتھا داعی یہ ہے کہ خدا کی لامحدود قوت وطاقت کے مقابلہ میں اپنی کمزوری ولاچاری کا تصور کرے اور یہ سوچے کہ وہ اس پر ہر طرح سے قدرت واختیار رکھتا ہے اور جب چاہے اور جس طرح چاہے اسے اپنی گرفت میں لے سکتا ہے اور یہ اس کے ادنیٰ اشارے کے سامنے اتنا بھی نہیں ٹھہر سکتا جتنا تنکا ایک طوفانی لہروں کے سامنے، اور ایک پر کاہ تند آندھی کے آگے۔ اور زمین وآسمان، سمندر، پہاڑ غرض کائنات کے کسی گوشہ میں پناہ نہیں لے سکتا۔ چنانچہ امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

اللھم انک طالبی ان انا ھربت ومدرکی ان انا فررت فھا انا بین یدیک خاضع ذلیل راغم ۔

اے اللہ اگر میں بھاگنا چاہوں تو مجھے ڈھونڈے گا اور اگر راہِ گریز اختیار کروں تو تو مجھے پالے گا۔ یہ دیکھ میں عاجز، ذلیل، خستہ حال تیرے سامنے کھڑا ہوں ۔

محرکاتِ رجاء پہلا محرک یہ ہے کہ اللہ کی ان نعمتوں پر نظر کرے کہ جن کے لئے نہ کچھ کہنے سننے کی ضرورت پڑی اور نہ کسی سفارش کرنے والے کی احتیاج ہوئی بلکہ اس نے ازخود پرورش وتربیت کے تمام سروسامان مہیا کر دیئے جو شکم مادر سے لے کر زندگی کے آخری سانسوں تک ہر ضرورت اور ہر حالت کے مطابق ملتے رہتے ہیں یہ انداز پرورش ونگہداشت اور بخشش ورحمت انسان کو آخرت کی کامرانی سے پُرامید کر سکتی ہے چنانچہ امام علیہ السلام اللہ کی ربوبیت وشفقت کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

حتّٰی انتھیت بی الی تمام الصورۃ واثبت بی الجوارح کما نعت فی کتابک نطفۃ ثم علقۃ ثم مضغۃ ثم عظما فکسوت العظام لحما ثم انشاتنی خلقا اخر کما شئت حتّٰی اذا احتجت الی رزقک جعلت لی قوتا من فضل طعام وشراب اجریتہ لامتک التی اسکنتنی جوفھا واودعتنی قرار رحمھا ۔

یہاں تک کہ تو نے مجھے اس حد تک پہنچا دیا جہاں میری صورت کی تکمیل ہوگئی پھر میرے اندر اعضاء وجوارح ودیعت کیے جیسا کہ تو نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ (میں) پہلے نطفہ تھا، پھر منجمد خون ہوا، پھر گوشت کا ایک لوتھڑا، پھر ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ، پھر ان ہڈیوں پر گوشت کی تہیں چڑھائیں پھر جیسا تو نے چاہا ایک دوسرے طرح کی مخلوق بنا دیا اور جب میں تیری روزی کا محتاج ہوا اور تیرے لطف واحسان کی دستگیری سے بے نیاز نہ رہ سکا تو تو نے مجھے ٹھہرایا اور جس کے شکم میں مجھے ودیعت کیا تھا میری روزی کا سروسامان کر دیا۔

دوسرا محرک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیض وکرم کی ہمہ گیری پر نظر کرے کہ اس نے اپنی نعمتوں اور

بخشائشوں سے نہ صرف زندگی کی راحت و آسائش اور جسم کی نشوو نما کا سامان کیا بلکہ روح کی تطہیر نفس کی اصلاح اور اخلاق کی تربیت کا بھی لحاظ رکھا اور جسم و روح کی ہر ضرورت کو پورا کرکے اپنی نعمتوں کو تکمیل کی حد تک پہنچا دیا تو جب دنیا میں اس کا لطف و احسان اتنا مکمل اور ہمہ گیر ہے تو آخرت میں اس کی رحمت و رافت اور شفقت و رحمت کتنی کامل، وسیع اور ہمہ گیر ہوگی۔ چنانچہ امام علیہ السلام اس کی نعمت اور بخشائش کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

الٰھی احمدك وانت للحمد اھل علی حسن صنیعك الی وسبوغ نعمائك علی وجزیل عطائك عندی وعلی ما فضلتنی من رحمتك واسبغت علی من نعمتك فقد اصطنعت عندی ما یعجز عنہ شکری ولولا احسانك الی وسبوغ نعمائك علی ما بلغت احراز حظی واصلاح نفسی ولکنك ابتداتنی بالاحسان ورزقتنی فی اموری کلھا الکفایہ۔

اے اللہ! میں تیری حمد کرتا ہوں اور تو ہی میرے ساتھ اچھے سے اچھا سلوک کرنے اور مجھ پر اپنی نعمتوں کے کامل کرنے اور بڑے عطیوں کے مرحمت فرمانے اور اس بنا پر کہ تو نے اپنی رحمت سے مجھے زیادہ سے زیادہ دیا اور اپنی نعمتوں کو مجھ پر فراواں کیا۔ تو نے وہ احسانات کئے ہیں جن کے شکر سے میں عاجز ہوں اور اگر تیرے احسانات نہ ہوتے اور مجھ پر تیری نعمتیں تمام نہ ہوتیں تو میں نہ اپنا حظ و نصیب حاصل کر سکتا تھا اور نہ اپنے نفس کی اصلاح کر سکتا تھا تو نے میرے ساتھ احسانات میں ابتدا کی اور تمام امور میں مجھے بے نیازی عطا فرمائی۔

تیسرا محرک یہ ہے کہ اللہ کی رحمت و رافت بے پایاں پر نظر کرے کہ اس نے ورحمتی وسعت کل شئی (میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے) کہہ کر سب کو اپنے فضل و عاطفت کے سایہ میں پناہ دی ہے، اور گنہگاروں اور خطا کاروں کو اپنی آمرزش و رحمت کی امید دلائی ہے۔ تو اس کی وسعتِ رحمت و وعدۂ مغفرت کے بعد یاس کے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں اور امید کی کرنیں جگمگانے لگتی ہیں۔ چنانچہ امام علیہ السلام کا ارشاد ہے:۔

وانت الذی تسبق رحمتہ امام غضبہ وانت الذی عطاؤہ اکثر من منعہ وانت الذی اتسع الخلائق کلھم فی وسعہ۔

تو وہ ہے جس کی رحمت اس کے غضب کے آگے چلتی ہے اور تو وہ ہے کہ جس کی عطائیں فیض و عطا کے روک لینے سے زیادہ ہیں اور تو وہ ہے جس کے دامن وسعت میں تمام کائنات ہستی کی سمائی ہے۔

چوتھا محرک یہ ہے کہ اس کے اجر و ثواب کی وسعت کو دیکھے کہ جسے دس گنا کبھی سات سو گنا، کبھی اس کا بھی دگنا اور کبھی بے حد و حساب سے تعبیر کیا ہے۔ تو یہ گیا اجر عظیم عمل کا نتیجہ اور استحقاق کا ثمرہ ہے۔ ایسا نہیں بلکہ یہ اس کی بخشش و انعام ہے اور اس کے جود و سخا کا تقاضہ ہے کہ وہ عمل و استحقاق کہیں بڑھ کر جزا و سزا دیتا ہے۔ تو جب اجر کے سلسلہ میں اس کا فضل و احسان اتنا بڑھا ہوا ہے تو وہ گناہوں سے درگذر کرنے میں کیوں کر اپنے

تقاضائے کرم سے کام نہ لے گا۔ چنانچہ امام علیہ السلام اس کی بخشش کے ثواب کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:۔

وانت الذی زدت فی السوم علی نفسک لعبادک ترید ربحھم فی متاجرتھم لک وفوزھم بالزیادۃ علیک والزیادۃ منک فقلت تبارک اسمک وتعالیت من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا۔

تو وہ ہے جس نے اپنے بندوں کے لیے لین دین میں اُونچے نرخوں کا ذمہ لیا ہے اور یہ چاہا ہے کہ وہ جو سودا تجھ سے کریں اس میں انھیں نفع ہو اور تیری طرف بڑھنے اور زیادہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوں چنانچہ تو نے جو مبارک نام والا اور بلند مقام والا ہے فرمایا کہ جو نیکی لیکر آئیگا اسے اس کا دس گنا اجر ملیگا۔

صحیفہ کی جامعیت

صحیفۂ کاملہ دُعاؤں اور مناجاتوں کا ہی ایک مجموعہ نہیں ہے بلکہ الوہیت کے رموز و اسرار عبودیت کے درہائے شہوار کا ایک خزینہ عامرہ ہے جو دل و دماغ کو عظمتِ الٰہی کے تصور سے معمور اور کاشانۂ عبودیت کو جمالِ حقیقت کے پرتو سے روشن و پرنور کردیتا ہے، اس سے خوف و رجا، محو و فنا، عشق و جذب، تسلیم و رضا اور بصیرت، آگہی و عرفانِ حقیقت کے سوتے اُبل کر تشنگانِ علم و عرفان کو سیراب کرتے اور یقین و طمانیت کے آبِ حیات سے قلب و روح کی پیاس بجھاتے ہیں۔ اس کے صفحات پر وہ حقائق و معارف پھیلے ہوئے ہیں جن کی قدر و قیمت کا اندازہ کچھ وہی افراد کرسکتے ہیں جنہوں نے فلسفہ الٰہیات کی پُرپیچ وادیوں کے چکر کاٹے ہوں اور حکمت و اخلاق کی ضخیم کتابوں کی ورق گردانی کی ہو۔ اس میں مبداء و معاد اور دوسرے اصولِ مذہب کو دعائیہ پیرایہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ہر اصل روحِ عقیدہ بن کر دل و دماغ میں اُتر جاتی اور قلب و روح میں سرائیت کرجاتی ہے اس کی دُعائیں اور مناجاتیں کائناتِ قدرت و مظاہرِ فطرت میں غور و خوض کی دعوت دے کر بصیرت پر جلا کرتی، شکوک و شبہات کے دھندلکوں کو چھانٹ کر حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی اور مایوسی، پست ہمتی اور دل شکستگی کے تصورات سے علیحدہ کرکے اُمید و رجا، اور بلند ہمتی و اولوالعزمی کے جذبات سے آشنا کرتی ہیں۔ ان دُعاؤں میں الٰہیاتی و نفسیاتی حقائق کے ساتھ اصلاحِ معاشرہ کے اصول، دین داری و خداپرستی کے ہدایات، طہارتِ نفس و پاکیزگیٔ قلب کے پیغامات اور فکری و اخلاقی ارتقاء کے وہ تعلیمات بھی پائے جاتے ہیں جو انسان کو اس بلندی پر پہنچا دیتے ہیں جہاں حکمت و اخلاق کی اونچی سے اونچی چوٹیاں اس کے قدموں کے لئے گزرگاہ بن جاتی ہیں اور زندگی کا ہر شعبہ اور فکر و عمل کا ہر گوشہ دینی و اخلاقی تنویروں سے جگمگا اُٹھتا ہے۔

صحیفہ کی غرض و غایت

صحیفہ کا نصب العین اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان میں خوف و رجا کے جذبات پیدا کرکے اسے روحِ عبادت سے آشنا کرے اور دُعائے سحرگاہی و نالۂ نیم شبی کی لذت سے ذوقِ نیازمندی کو تسکین بخشے اور طلب و دعا اور عجز و نیاز کا سلیقہ سکھائے

اور تہذیبِ نفس، پاکیزگیِ کردار، تعمیرِ اخلاق، تشکیلِ سیرت، اور تطہیرِ قلب و رُوح سے انسانیت کے جوہر نکھارے اور اسلامی حقیقتوں کو ان کے صحیح خد و خال کے ساتھ ظاہر و آشکارا کرے لیکن یہ مقاصد صرف دُعاؤں کے الفاظ دُہرانے سے حاصل نہیں ہوتے جب تک ان کے معنی و مطالب پر نظر نہ ہو اور اس کے ساتھ طلب و دُعا میں جوش و ولولہ اور دل میں قصد و ارادہ بھی ضروری ہے۔ اور اگر صرف الفاظ کی ترکیب و ترتیب پر اکتفا کر لی جائے اور معنی و مفہوم کے سمجھنے کی ضرورت نہ سمجھی جائے تو پھر نیت اور ارادہ کے بغیر بھی دُعائیں قبول ہو جایا کریں اور قصد و خواہش کے بغیر بھی سیرت و کردار میں حُسن پیدا ہو جایا کرتا۔ اور ایسا ہوتا تو یہ شعبدہ گری کا ایک کرشمہ ہوتا کسی طلب و تاثر کا نتیجہ نہ ہوتا۔ ہاں اگر قصد و طلب کے ساتھ الفاظ بھی موقع و محل کے مناسب اور رفعت و الوہیت کے شایانِ شان ہوں تو قبولیت میں معین و استجابت پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور علی الخصوص وہ الفاظ جو ان خاصانِ خدا کی زبان سے نکلے ہوں جو عبودیت کے رمز آشنا، الوہیت کے ادا شناس اور بارگاہِ ربوبیت میں آدابِ کلام سے واقف ہوں اور معنی و مفہوم کے سمجھنے کے ساتھ اگر طلب و دُعا کے آداب و شرائط اور درود و مناجات کے اوقات و لمحات بھی ملحوظ رکھے جائیں تو دُعا کی اثر انگیزی اور بڑھ جائے گی اور استجابت اور قبولیت سے جلد ہمکنار ہو گی۔ ۰ ۰

حسن ساجد

ایران کا آخری نامور شاعر

حافظ

(ایک تعارف)

حافظ کا شمار اُن چند خوش نصیب اربابِ قلم میں ہوتا ہے جنہیں ان کی زندگی ہی میں شرفِ قبولیت حاصل ہوا اور جن کی مقبولیت پر ماہ وسال کی گرد محیط نہ ہو سکی، دہر و ماہ کی صدیوں کی گردش کے باوجود اُن کا آفتابِ کمال اُسی طرح تاباں و درخشاں ہے جیسے وہ آج بھی ہمارے آفاق کی زینت ہوں۔ ہمارے اہلِ قلم افراد میں مرزا غالب کا نام لیا جا سکتا ہے کہ جیسے جیسے دنیائے فکر کا کارواں آگے بڑھ رہا ہے ویسے ویسے غالب شناسی کی کاوشوں میں اضافہ ہو رہا ہے مگر یہ مقبولیت جو مرزا کو آج نصیب ہے خود اُن کے عہد میں اس کی عشرِ عشیر بھی حاصل نہیں تھی ورنہ انہیں یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آتی؟

ع میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

حافظ کو اُن کے عہد ہی میں نمایاں مقام مل گیا تھا اُن کے فن نے نہ صرف اہلِ ایران کو گرویدہ بنا لیا تھا بلکہ ان کی شہرت ترکی و ہندوستان پہنچ چکی تھی۔

خواجہ شمس الدین محمد چودھویں صدی عیسوی کے ربع ثانی کے آغاز میں یعنی ۱۳۲۶ء میں سرزمینِ شیراز پر طلوع ہوئے یہ منگول حکمرانی کے عہد کا آخری زمانہ تھا ۔ اِس اعتبار سے اُن کا دورِ حیات اربابِ اقتدار کے درمیان تموج و تلاطم کا زمانہ تھا متعدد حکومتیں بنیں اور بگڑیں کئی بار شیراز اُجڑا اور آباد ہوا خواجہ حافظ نے اپنی آنکھوں سے یہ اُتار چڑھاؤ دیکھا اور خاموش رہے۔ پروفیسر امرت لعل عشرت نے اپنی وقیع تالیف "ایران صدیوں کے آئینہ میں" حافظ کی اس کیفیت کا اظہار یوں کیا ہے:

"خوفناک جنگوں اور طربناک محفلوں کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن خواجہ حافظ کے کلام پر عموماً ان عارضی غموں اور وقتی خوشیوں کی چھاپ بہت کم دکھائی دیتی ہے، انھوں نے مختلف حوادث کی مذمت اور تخت نشینوں کی تقاریبِ سعید کو موضوعِ شعر نہیں بنایا اُن کے تصور کی آنکھ نے ان سطحی واقعات اور انفرادی زندگی کے نشیب و فراز کی بجائے پوری انسانی زندگی اور اس کے لازوال دائمی اقدار کو پیشِ نظر رکھا۔"

("ایران صدیوں کے آئینے میں" ص ۲۱۹)

حقیقت یہ ہے کہ حافظ بے ثباتی عالم کے راز سے واقف تھے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ہر سحر کو آب وتاب کے ساتھ طلوع ہونے والا مہر شام کی آغوش میں پہنچ کر بظاہر اپنی چمک دمک کھو دیتا ہے۔ ان اقتدار پسندوں کی تاب بھی لمحاتی ہے غروب تو ان سورجوں کو بھی ہونا ہی ہے بلکہ روز طلوع ہونے والا آفتاب تو شب بھر پردۂ خفا میں رہنے کے بعد دوسری صبح کو پھر نئی توانائی کے ساتھ نمودار ہو جاتا ہے مگر شاہی اقتدار کا سورج ایک بار غروب ہوا تو دوسری بار سر اُبھارنے کا اسے موقع ہی نہیں ملتا۔

خواجہ شمس الدین کے والد　　کا نام بہاء الدین تھا ان کی شخصیت ایسی نہیں تھی جس کا شمس الدین محمد کوئی بڑا سماجی فائدہ اُٹھا سکتے اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ خواجہ حافظ کی شہرت اُن کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کی مقبولیت بلا شرکتِ غیرے اُن کی اپنی صلاحیتوں کی رہینِ منت ہیں۔ خواجہ صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف ہر اہلِ نظر کو ہے۔ یہ درست ہے کہ انھوں نے "مضامین نو کے انبار" نہیں لگائے مگر اُنھوں نے اپنے تصورات و تخیلات کو جس انداز میں پیش کیا اس نے ان کی انفرادیت کا قائل کر دیا۔ حافظ نے عرفانی اور عاشقانہ مضامین کو اس طرح سمو دیا کہ دونوں جذبے اپنی انفرادیت کے تحفظ میں کامیابی کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے اس طرح سہیم و شریک نظر آتے ہیں کہ اس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں کم ہی مل سکتی ہے ؎

آتش آں نیست کہ از شعلۂ او خندد شمع
آتش آنست کہ در خرمن پروانہ زدند

حافظ محض تخلص کے حافظ نہیں تھے بلکہ حقیقتاً حافظ قرآنِ کریم تھے اور حفاظ میں بھی وہ عام حافظوں کی صف میں نہیں تھے بلکہ اس میدان میں بھی　　ان کی انفرادیت مسلم ہے۔ سید العلماء مولانا سید علی نقی مرحوم نے اپنی تحقیقی کتاب "تذکرۂ حفاظ شیعہ" کی دوسری جلد میں حافظ شیرازی کے حال میں تحریر فرمایا ہے کہ انھوں نے چودہ روایتوں سے قرآنِ کریم حفظ کیا تھا اور خود حافظ نے اپنے ایک شعر میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے ؎

"عشقت رسد بفریاد گر خود بسان حافظ
قرآن ز بر بخوانی با چاردہ روایت"

(تذکرہ حفاظ شیعہ، جلد دوم ص ۱۰۹)

حافظ نے متعدد اشعار میں اپنے حافظِ قرآن ہونے کا ذکر کیا ہے یہاں صرف ایک شعر اور نقل کیا جاتا ہے۔

نہ دیدم خوشتر از شعرِ تو حافظ
بہ قرآنی کہ اندر سینہ داری

یہ حفظ قرآن ہی کا فیض ہے کہ خواجہ حافظ کے اکثر اشعار رموزِ قرآنی کے آئینہ دار ہیں، یہ محل نہیں کہ،

حافظ کے اس کمال فکر پر بحث کی جائے کیونکہ یہ موضوع وسعت چاہتا ہے۔ البتہ یہ بس ہے کہ حافظ کو حفظِ کلامِ الٰہی سے اتنی انسیت تھی کہ انھوں نے اپنا تخلص حافظ رکھ لیا۔

ہمارے ادب میں میر تقی میر کے اکثر اشعار ایسے ہیں جن میں خواجہ حافظ کے کلام کی جھلک نظر آتی ہے اگر یہ دونوں ایک ہی عہد کے ہوتے تو یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوتی کہ دونوں کا انداز فکر تقریباً یکساں ہے مگر حافظ میر سے بہت پہلے سپہر ادب پر جلوہ بار ہو چکے تھے لہٰذا میر کے ان مماثل اشعار کو اکتساب فیض ہی کہا جا سکتا ہے جن میں حافظ شیرازی کے نظم کردہ مضامین نظر آتے ہیں۔

مثلاً میر کا یہ شہرۂ آفاق شعر حافظ کی آواز بازگشت ہی معلوم ہوتا ہے ؎

سب پہ جس بار نے گرانی کی
میر
اُسے یہ ناتواں اٹھا لایا

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
حافظ
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

اور اب شعر ملاحظہ فرمائیں جس میں میر نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے دنیا کو بس صورتاً دیکھا اس کی معنویت پہچاننے میں صرفِ نظر سے کام لیا ہے۔

سرسری تو جہان سے گزرا
میر
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

حافظ
درچمن ہر ورق دفتر حال دگرست
حیف باشد کہ ز حال ہمہ غافل باشی

حافظ نے اپنے ایک شعر میں اپنی قبر کو زیارت گاہ قرار دیا ہے، یہ اُن کا اپنا اندازِ بیان تھا کہ انھوں نے "زیارت گہہ رنداں" کی شرط لگا دی حالانکہ یہ شعر عمومی زیارت گاہ کی غمازی کرتا ہے۔

برسرِ تربت ما چوں بگذری ہمت خواہ
حافظ
کہ زیارت گہہ رندانِ جہان خواہد بود

تقریباً یہی مفہوم میر کے ایک مقطع میں ادا کیا گیا ہے مگر میر کو اس کیفیت کی ادائیگی میں چار مصرعوں کا سہارا لینا پڑا

تربتِ میر پہ ہیں اہلِ سخن
ہر طرف حرف ہے حکایت ہے
تو بھی تقریبِ فاتحہ سے چل
بخدا واجب الزیارت ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ میر کا یہ قطعہ بند مقطع بہت ہی پُر اثر ہے اہلِ سخن کی شرط حرف و حکایت کا تذکرہ پھر محبوب سے فاتحہ خوانی کی التجا اس قسم کے ساتھ کہ قبر میر زیارت کے لائق ہی نہیں بلکہ اس کی زیارت واجب ہے لیکن بہر حال یہ نقشِ ثانی ہے نقشِ اول تو حافظ ہی کا شعر ہے۔

حافظ شیرازی سے ہندوستان کے بیشتر شعرا نے اکتسابِ فیض کیا ہے ان کے فکر و فن کے عکس جا بجا ہمارے شعراء کے کلام میں نظر آتے ہیں۔ یہ اُن کے فن کا کمال اور ان کی مقبولیت کا اثر ہے۔ ہندوستان میں حافظ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ۱۷۹۱ء میں کلکتے ہی میں چھپا تھا۔

حافظ اپنی غزلوں کی وجہ سے اپنی صدی اور اس کے بعد بھی ہر صدی کے مقبول شاعر رہے ہیں اگرچہ انھوں نے غزل کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن میں بھی اپنی فنی مہارت دکھائی ہے، انھوں نے مذہبی شاعری بھی کی ہے۔ قصائد نظم کئے ہیں، رُباعیاں کہی ہیں اور بہت سے ممدوحین کی خدمت میں منظوم جذباتِ عقیدت پیش کئے ہیں نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں انکے چند ایسے اشعار کا تذکرہ کر دیا جائے جو انھوں نے بطور عقیدت نظم کئے ہیں، انھوں نے ایک شعر میں محبتِ رسولؐ و آلِ رسولؐ کا اظہار یوں کیا ہے؛

حافظ زجاں محبِ رسولؐ است و آلِ اُو
برایں سخن گواست خداوندِ اکبرم

وہ فیضِ رحمتِ خداوندی کا سرچشمہ ذاتِ علیؑ کو سمجھتے ہیں، یہ رُباعی ملاحظہ فرمائیں؛

مردی زکنندۂ درِ خیبر پرس | اسرارِ کرم زخواجۂ قنبر پرس
گر تشنۂ فیضِ رحمتی ای حافظ | سرچشمۂ آں زساقی کوثر پرس

اپنے ایک قصیدے میں وہ حضرت علیؑ کی مدح سرائی یوں فرماتے ہیں۔

امام جنّی و انسی علیؑ بود کہ علیؑ ز کُل خلق فزوں است از صغار و کبار

ز نام اوست معلق نہاد کرسی و عرش ز ذات اوست مطبق زمیں بدیں ہنجار

علیؑ امام و علیؑ امین و علیؑ ایماں علیؑ امین و علیؑ سرور و علیؑ سردار

اب یہ قصیدہ دواوین حافظ میں نہیں پایا جاتا لیکن ۴۳ اشعار پر مشتمل یہ قصیدہ مولانا عدیل اختر نے اپنی موقر تحقیقی تصنیف "علمی نیرایتیں" میں صفحہ ۱۱۰ تا ۱۱۲ پر نقل کیا ہے۔ (اس کے متعلق پوری بحث کے لیے ملاحظہ ہو "علمی نیرایتیں" ص ۱۰۷ تا ۱۱۳)

یہ حقیقت ہے کہ حافظ نے جس صنف سخن میں اپنی طبع خداداد کے جوہر دکھائے ہیں، اس پر اپنے اندازِ فکر کے گہرے نقوش مرتسم کر دیے ہیں لیکن اس بدیہی حقیقت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ حافظ آج جس منزل بلند پر متمکن ہے وہاں تک ان کی رسائی کا زینہ ان کی غزلیہ شاعری ہے۔ حافظ کی غزلوں میں رندی و سرمستی کے ساتھ ساتھ وہ رموز و نکات بھی پائے جاتے ہیں جن کے تناظر میں انہیں اہلِ نظر نے لسان الغیب کا لقب دیا تھا، انھیں بجا طور پر بلبلِ شیراز بھی کہا جاتا ہے، اُن کی غزلوں میں وہ نغمگی ہے جو انھیں مذکورہ لقب کا مستحق بناتی ہے۔ پروفیسر ذبیح اللہ صفا نے انھیں ایران کا آخری نامور شاعر لکھا ہے ممکن ہے یہ بھی درست ہو۔

یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں کہ حافظ سے حسد کرنے والے بھی کچھ پیدا ہو گئے شاید ایسے ہی مواقع کے لیے غالب نے کہا تھا ؎

غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

پروفیسر امرت لعل عشرت نے احمد کسروی کا ذکر کیا ہے کہ احمد کسروی نے "حافظ چہ می گوید" میں جس قسم کی تنقید کلامِ حافظ پر کی ہے اس سے کلامِ حافظ کی کمزوری تو ظاہر نہیں ہوتی البتہ خود نکتہ چیں کی بدذوقی ضرور پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔ (ایران صدیوں کے آئینے میں، ص ۲۱۹)

حافظ شیرازی بجائے خود ایک ایسا ہمہ جہت موضوع ہے جس پر ضخیم کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ابھی لکھی جا رہی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی۔ اس مختصر سے مضمون میں اس کی گنجائش نہیں اور میری کم علمی بھی اس کی متحمل ہو سکتی ہے کہ حافظ جیسے عظیم شاعر کا مبسوط جائزہ لے سکے۔ حافظ کی غزلوں کے چند اشعار پیش کر رہا ہوں جن سے ان کی عظمت پر ہلکی سی روشنی پڑ سکتی ہے۔ اور یہ اشعار کسی سخت گیر انتخاب کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ جو اشعار سامنے آ گئے انھیں نقل کر دیا ہے۔ ان کی صحیح عظمت کا اندازہ تو صرف وہی کر سکتے ہیں جو خود بھی دقتِ نظر کے حامل ہوں۔

غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود　　　ز ہر چہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است

آتش آں نیست کہ از شعلۂ او خندد شمع　　　آتش آنست کہ در خرمن پروانہ زدند

یارب از ابر ہدایت برساں بارانی　　　پیشتر زاں کہ چو گردی و میاں برخیزم

من نگویم کہ کنوں باکہ نشیں وچہ بنوش　　　کہ تو خود دانی اگر زیرک و عاقل باشی

آسماں بار امانت نتوانست کشید　　　قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

گفت آں یار کزو گشت سر دار بلند　　　جرمش ایں بود کہ اسرار ہویدا میکرد

گوہری کز صدف کون و مکاں بیروں بود　　　طلب از گم شدگان لب دریا میکرد

حافظ کی غزلیں رموز و عرفان کا سرچشمہ ہیں، عشق حقیقی و عشق مجازی کی تصویریں ہیں۔ رندی و سرمستی ان کی غزلوں کا جوہر ہے، عرفان و تصوف ان کے اشعار میں رچے بسے ہیں۔ انھوں نے اپنے فن کو اس بلندی پر پہنچا دیا کہ پروفیسر ذبیح اللہ صفا کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ حافظ ایران کا آخری نامور شاعر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ایسی شخصیتیں صدیوں کی گردشوں کے بعد ترش کر سامنے آتی ہیں اور پھر آئندہ کئی صدیوں تک دوسری عظیم شخصیتوں کی تراش خراش کے عمل میں معاونت کرتی ہیں۔

قمر احسن

مرزا دبیر کے ایک مرثیہ میں استعاراتی نظام

اُردو مرثیہ کو نقصان دو طرح کے لوگوں نے پہونچایا ہے، ایک وہ جنھوں نے اسے محض ثواب دارین کے حصول کا ذریعہ جانا اور دوسرے وہ لوگ جو اسے محض رونے رولانے کی چیز سمجھے۔ بہت کم ایسے صاحبانِ نظر ہیں جنھوں نے اس کی ادبی، علمی اور شعری اہمیت پر غور کیا ہے۔ لیکن جنھوں نے ان محاسن پر توجہ کی ہے وہ اس بات پر مجبور ہوے ہیں کہ اسے بڑی شاعری میں شمار کریں، کسی خوش عقیدگی کی بنا پر نہیں بلکہ اس لیے کہ اس صنف میں وہ عناصر موجود ہیں جو کسی شاعری کو بڑا بناتے ہیں۔

اس صنف کی ادبی شناخت بالعموم اس کے موضوع سے کی جاتی ہے اس لیے کہ اس صنف کی کوئی شعری ہیئت کبھی مخصوص نہیں ہوپائی۔ کبھی دوبیتی اور مستزاد کی شکل ہی رہی تو کبھی مثنوی، ترکیب بند ترجیع بند کی ہیئت میں۔ سوداؔ نے اس کی ہیئت پر کئی مزید تجربات کیے تھے لیکن قبول عام مسدس کی ہیئت کو حاصل ہوا۔

ان کربلائی مرثیوں کی ابتدا، دراصل روضہ خوانی سے ہوئی ہے۔ حالانکہ عربی زبان میں شخصی مرثیوں کی ایک بڑی اور اہم روایت رہی ہے لیکن وہ افراد، قبائل اور علاقہ میں ہی محدود رہتی تھی۔ کربلائی مرثیوں کے پس منظر میں ذاتی، قبائلی اور مذہبی المیہ کے ساتھ ساتھ ثواب اخروی کا تصور بھی شامل تھا۔ اس طرح اس بیان میں جہاں مذہبی عقائد داخل تھے وہیں اس کی ایک عمومی شکل بھی بنتی جارہی تھی جس کے نتیجہ میں اس میں فوک ایلیمنٹ بھی شامل ہوتے گیے۔ جس کے زیر اثر شعری صنائع بدائع کے بجائے سادگی اور اثر آفرینی کی کیفیات حاوی رہیں۔ مثال کے طور پر عربی، فارسی اور اردو کے ابتدائی کربلائی مرثیے ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں لیکن جیسے جیسے یہ مرثیے ایک موضوعاتی صنف سخن کے طور پر مقبول ہوتے گیے اس میں بہتر اور بڑی شاعری کے اجزا شامل ہوتے گیے۔

اس بحث سے قطع نظر کہ بڑا موضوع بڑی شاعری کا ضامن ہے یا نہیں، اب یہ حقیقت ہے کہ مرثیہ میں وہ تمام عوامل و عناصر موجود ہوتے ہیں جو بڑی شاعری کی ضمانت ہوتے ہیں۔ اور وہ تمام موضوعات بھی بہ استثنائے چند، مرثیہ میں موجود ہوتے ہیں جو کسی بھی زبان کی اعلیٰ شاعری میں تلاش کیے جاتے ہیں۔ بات صرف انھیں برتنے اور ان کے امکانات کو بروئے کار لانے کی

ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے مراثی میں یہ عناصر و عوامل اپنی تمام ادبی اور شعری شان و شوکت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

انھیں عناصر میں ایک عنصر استعارہ بھی ہے جو کسی بھی بہتر شاعری کی ناقابل تردید شناخت ہے۔ غزل میں استعارہ بالعموم ایک شعر تک محدود ہوتا ہے۔ مختصر یا طویل نظم میں مختلف استعاروں کا ایک نظام ہوتا ہے لیکن نظم گو شاعر کے لیے عام طور پر یہ پابندی نہیں ہوتی کہ شروع سے آخر تک کسی مخصوص فرد، کردار یا واقعہ کی مناسبت سے ہی استعاراتی نظام قائم کیا جائے۔ مرثیہ میں جہاں شاعر کو یہ آسانی ہے کہ اسے کردار، افراد یا واقعات خلق نہیں کرنے پڑتے بلکہ کردار اور ان کے صفات، واقعات اور ان کی تفصیلات سب اسے مذہبی یا تہذیبی ورثہ کے طور پر ملے ہوتے ہیں وہیں اس کے لیے یہ دشواری بھی ہوتی ہے کہ ابتدائی بندوں سے لیکر آخری بند تک اسے کسی مخصوص کردار یا واقعہ پر مرکوز کرنا پڑتا ہے، اور اس کی مناسبت سے استعاراتی نظام بھی قائم کرنا پڑتا ہے۔ لہذا یہاں شاعر کو نسبتاً دشواری ہوتی ہے اور نظم کی بہ نسبت اسے مرثیہ میں بہت محتاط رہنا پڑتا ہے، کبھی حفظِ مراتب کا لحاظ کبھی مذہبی عقائد اور کبھی کردار کی شان اسے آزاد نہیں ہونے دیتی۔

استعارہ بہتر شاعری کا خاصہ ہے اور مرثیہ میں اس کی اہمیت یوں بڑھ جاتی ہے کہ یہ الفاظ کلیدی اور مرکزی استعاراتی نظام قائم کرتے ہیں۔ یہ قطعاً ضروری نہیں ہے کہ شاعر نے وہ الفاظ یا استعارہ ہر جگہ سوچ سمجھ کر ہی استعمال کیا ہو بلکہ بہتر شاعر کا ذہن اس کردار اور شخصیت یا واقعہ کے تصور کے ساتھ ہی اس کے مناسبات پر قابو پالیتا ہے اور وہ الفاظ اپنے آپ نوکِ قلم پر ایک استعاراتی نظام کے تحت آتے رہتے ہیں۔ یوں بھی یہ بات کم اہم ہے کہ استعارے خود ساختہ ہیں یا اسے مذہبی اور تہذیبی وابستگی کے تحت ورثہ میں ملے ہیں۔ اہمیت اس نکتہ کی ہے کہ یہ بنیادی اور کلیدی الفاظ یا استعاراتی نظام کن تشریحات اور کس جہانِ معنی کی طرف لے جاتا ہے یا ان کے استعمال کی شعری اور ادبی قدر و قیمت کیا ہے، اس نے مناسبات لفظی و معنوی کا لحاظ رکھا ہے یا نہیں۔ استعاراتی نظام میں پختہ کاری کتنی ہے۔ ان کا آپسی ربط و نظام موجود ہے یا مفقود۔ ان میں آپس میں تضاد تو نہیں ہے۔ اور ان استعارات سے شاعر نے کیا کام لیا ہے کیا وہ اس فرد، کردار یا واقعہ کے مزید پہلوؤں پر روشنی ڈال رہا ہے۔ اس کے اثبات اور شناخت کے عمل کو آگے بڑھا رہا ہے۔ کہیں ایسی قبیح صورتِ حال تو نہیں پیدا ہو رہی ہے کہ نہ حفظِ مراتب کا لحاظ ہے نہ صورتِ حال کا۔ جو استعارہ شانِ امام کے لیے ہے وہی جون غلام ابی ذر کے لیے۔ ایک استعارہ امام کو بے چارہ بتا رہا ہے تو دوسرا مالک کون و مکان۔ استعاراتی نظام میں بھی میز اور مابہ الامتیاز کا ہونا ضروری ہے۔ اور ان نکات کو پیش نظر رکھنا کمال شاعری ہے۔

زیر نظر مرثیہ سیفی کا نمونہ مرثیہ شمشیر زباں ہے جناب عباس کا مرثیہ ہے یہاں مرزا دبیر کو مذہبی اور تہذیبی ورثہ

کا کُنات

کے طور پر بہت سے اشارئے 'استعائے اور کلیدی الفاظ اپنے آپ مل گئے مثلاً علمداری، وفا آشنائی، بریدہ بازو وغیرہ وغیرہ لیکن اگر شاعر نے محض انھیں الفاظ پر اپنی شاعری کی اساس قائم کی ہوتی تو اس کا شعری مرتبہ وہ نہ ہوتا جو اب اس مرثیہ کا ہے۔ استعاروں اور شاعری کی دوسری اعلیٰ صفات سے یہ مرثیہ بھرا ہوا ہے چونکہ مرثیہ میں استعمال کیے گئے تمام استعاروں پر روشنی ڈالنا ممکن نہیں ہے لہذا صرف ان استعاروں کی طرف اشارہ مقصود ہے جو کلیدی یا مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور جن پر استعاراتی نظام قائم ہے یہ استعائے شروع سے آخر تک مربوط بھی ہیں اور ہر جگہ نئے مفاہیم کی طرف بھی لے جاتے ہیں — مرثیہ کی ابتدا میں ہی مرزا صاحب نے جناب عباس کی شخصیت اور عوام میں مقبول ان کے تصور کی بنیاد پر سیف اور شمشیر کا استعارہ خلق کیا ہے۔

سیفی کا نمونہ مری شمشیر زباں ہے اللہ کی تلوار کے جوہر کا بیاں ہے	بند ۱ مصرعے ۱-۲

اور اس کی مناسبت سے جوہر، قبضہ۔ جاں۔ زباں، رواں۔ رن۔ لڑنا وغیرہ لاتے ہیں اور اس کی توجیہہ دوسرے بند میں خود بھی کر دی۔

عباس دلاور کا لقب سیف خدا ہے۔ بند ۲ مصرع ۱

اسی بنیادی استعارہ کو قائم کرتے ہوئے یعنی اس کے مناسبات کو پیش کرتے ہوئے دو بندوں کے بعد شاعر کو احساس ہوتا ہے کہ عوام میں مقبول جناب عباس کا یہ تصور ان کی شخصیت کی شان و ان کے صبر و ضبط۔ ان کے علم و اخلاق کا احاطہ نہیں کر رہا ہے۔ جناب عباس کے لیے محض ایک سفاک تلوار کا استعارہ ان کی عظمت کے خلاف ہے لہذا دوسرے مرکزی اور کلیدی استعارہ کی جستجو کرتے ہیں لیکن دوسرا استعارہ قائم کرنے سے پہلے اس کے مناسبات کا ذکر کر رہے ہیں۔ تیسرے بند میں ہی بحر، قطرہ، ماہ، موجیں جیسے استعائے قائم کر کے پانچویں بند میں دریکتا کا دوسرا کلیدی اور مرکزی استعارہ پیش کرتے ہیں جو استعاراتی نظام کے تحت مرثیہ میں آخر تک مربوط رہتا ہے اور جس کی مدد سے جناب ممدوح کی شخصیت کے دوسرے اہم پہلو سے متعارف کراتے ہیں چونکہ یہ دونوں استعائے ایک ہی ذات کے دو پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں اس لیے دونوں کے مناسبات بھی بار بار آئے ہیں۔ اس پانچویں بند میں دریکتا کے ساتھ بحرین، درشہوار، صاف، موتی اور درنجف کے استعائے خاص طور سے میرے اس دعویٰ کی دلیل میں ہیں۔

کیونکر دریکتا کے خریدار نہ ہوں گے بحرین میں ایسے درشہوار نہ ہوں گے دیکھو تو سہی صاف ہیں موتی یہ نجف کے	بند ۵ مصرعے ۳،۴،۶

چھٹے بند میں پھر تلوار کا استعارہ ہے اور پورا بند اس کے مناسبات سے پُر ہے۔

ممدوح میرا نام خدا سیف خدا ہے۔ بند ۶ مصرع ۱

اور آٹھویں بند کے پانچویں اور چھٹے مصرعوں میں پھر موتی اور اس کے مناسبات سے تعارف کرایا ہے۔

دریا دل و نیساں کف و پابند کرم ہے | بند ۸ مصرعے ۵۔۶
یہ آبروئے ہمت سقائے حرم ہے |

دسویں بند میں جناب ممدوح اور جناب جعفر طیار کے درمیان مماثلتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھی اسی استعارہ کو استعمال کیا ہے۔

یاقوت کے پر لگ گئے موتی میں صدف کے بند ۱۰ مصرع ۶

اور صرف موتی پر اکتفا نہ کر کے پہلے قائم استعارہ تلوار کو بھی دوہرایا ہے۔

اُس آئینہ میں دیکھتے تھے تیغ کے جوہر بند ۱۹ مصرع ۲۔۶

چوبیسویں بند کے تین مصرعوں اور ۲۶ ویں بند کے چھٹے مصرع میں پھر موتی اور اس کے مناسبات کا ذکر ہے 'یاقوت' زمرد، موتی، تجلی وغیرہ

جب جناب عباس کی پیدائش کے ذکر پر آتے ہیں تو ان دونوں کلیدی استعاروں کی معنویت اور بڑھ جاتی ہے

در رنگ صدف نیک پسر نیک بدر نیک بند ۴۳ مصرع ۲

یا

بحرین بکائے کہ دُر بے بدل آیا بند ۴۴ مصرع ۲

یا

اک تیغ بہ تھی قبضۂ قدرت میں خدا کے | بند ۴۴ مصرعے ۵۔۶
سو ہاتھ لگی آج شہ عقدہ کشا کے |

۵۳ ویں اور ۵۴ ویں بند میں پھر آپ کی شخصیت کے دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں:

کچھ ہوش سنبھالا تھا کہ تلوار سنبھالی بند ۵۳ مصرع ۵

اور

ہمت میں گراں قدر تھے یوں جن و بشر سے | بند ۵۴ مصرعے ۵۔۶
جس طرح گہر سنگ سے اور لعل گہر سے |

اِس کے بعد کے بندوں میں ان دونوں کلیدی استعاروں کے بہت سے مناسبات نظم کئے ہیں جنھیں بہ نظر طوالت ترک کرتے ہوئے جناب عباس کی رَن میں آمد کے ذکر پر آتا ہوں۔ یہاں بھی شاعر نے اپنے قائم کیے استعاراتی نظام کو باقی رکھا ہے۔

جب ہاتھ میں تلوار کا پرَتو نظر آیا
خورشید کے پنجہ میں مہ نو نظر آیا
بند ۹۲۔ مصرعے ۵،۶

اور

دریا سے یہ دریافت کرو یا کہ صدف سے
بہتر کوئی موتی نہیں اس دُرِ نجف سے
بند ۱۱۰۔ مصرعے ۵،۶

جناب عباس کے ساتھ پانی کا جو تصور ہے اس کی مناسبت سے بھی تلوار اور موتی کے استعارے ان کے تعارف کے لیے جگہ جگہ استعمال کیے ہیں۔ کہیں الگ الگ اور کبھی ایک ساتھ۔

ایک جگہ حفظِ مراتب کا لحاظ دیکھیے کہ جب پانی یا تلوار کا استعارہ جناب عباس کے لیے استعمال کیا تو امام عالیمقام کو کس طرح ممتاز کیا ہے۔

پانی۔ یہ نورِ خدا آب بقا خاکِ شفا ہیں
تلوار۔ یہ ہیں سپر ایمان کی ہم تیغِ خدا ہیں
بند ۱۱۲۔ مصرعے ۱۔۳

جب ایک جری میدانِ کارزار میں آجاتا ہے تو اس کی شخصیت کے دوسرے پہلو مثلاً سخاوت یا علم پس پشت چلے جاتے ہیں۔ یہاں وہ شجاعت کے جوہر ہی دکھاتا ہے میدانِ جنگ میں لفاظی نہیں تلوار کا کام رہ جاتا ہے۔ جناب ممدوح کی ذاتِ والاصفات کا یہ پہلو میدانِ کارزار میں کس قدر شدت سے اسی مرکزی استعارہ کے توسط سے نمایاں ہوتا ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے آمد کے بعد کے تمام بندوں پر توجہ ضروری ہے۔ ہر بند نہ صرف ایسے استعارات اور اس کے مناسبات سے مملو ہے بلکہ بڑی شاعری کا بہترین نمونہ بھی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

بابا مرا اللہ کا شیر اور میں شمشیر
خیبر شکن اس عہد کا ہوں صف شکنی میں
جوہر مرے کھل جائیں گے شمشیر زنی میں
بند ۱۱۴۔ مصرعے ۴،۵،۶

اور دوسرا پہلو دیکھیے:۔

ہر قطرہ گہر بنتا ہے معدن میں ہمارے بند ۱۱۵۔ مصرع ۲

اور اب جنگ کا منظر نامہ ہے شخصیت کے دونوں پہلو ایک ہو چکے ہیں وہی ذات موتی ہے وہی شمشیر۔ اس کے پانی سے اب مفر کہاں، وہی آب آب تھا ہے۔ جو کرم تھا وہی قہر بن گیا، وہی چمک اب بجلی بن گئی۔ اس لیے کہ میدانِ جنگ میں نرمی نام ہے بزدلی کا لہٰذا دونوں مرکزی استعاروں کا اجتماع واضح شکل میں سامنے آتا ہے اور ان کے مناسبات پر بھی غور کریں:۔

ہر سو جو گیا قلزمِ لشکر کا نظارا

(فوجِ مخالف کے لیے قلزم کا استعارہ بھی قابلِ توجہ ہے:

دل تیغ کے پیراک کا بھر آیا قضا را

(تیغ، قضا، پیراک اور بھر آنا خاص توجہ کے مستحق ہیں)

عباس کا پایا جو سرِ دست اشارا
ملبوس نیام اس نے نہانے کو اتارا
غوطہ کا مزہ صاف لبِ تیغ پر آیا
پانی لبِ ساحل کی طرح منہ میں بھر آیا

بند ۱۱۹

یہ بند اور اس کے بعد کے ۱۵ بند بہترین شاعری کی بین مثال پیش کرتے ہیں۔ اور استعارہ کا وہ نظام جس کی طرف راقم نے اشارہ کیا ہے ان بندوں میں اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے۔

سب ضرب دمِ تیغ سے الموت پکارے
تھا بحرِ خفیف آپ دمِ تیغ کے مارے
غرقاب غرض قطعے زمیں کے ہوئے سارے
زاہد کو تیمم کا ٹھکانا نہ کہیں تھا
شاعر کے لیے بہرِ سخن قحط زمیں تھا

بند ۱۲۰ مصرعے ۱-۲-۳-۴-۵-۶

اسی کے ساتھ شاعری کا علوئے کمال بھی ملاحظہ ہو اور مرکزی استعارے بھی پیشِ نظر رہیں:۔

باراں کی دُعا تیغ پہ جوہر سے رقم تھی
طوفاں تھا وہ قبضہ میں کہ موج اس کی ستم تھی
اک بوند تلاطم میں سمندر سے نہ کم تھی
جو کشتیِ ہستی تھی وہ غرقابِ عدم تھی

بند ۱۲۱ مصرعے ۱ تا ۴

یا

طغیانیِ آب و شررِ تیغ دو دم سے
طوفانِ جہنم کے دھواں اٹھا ارم سے
شمشیر تھی ہشیار اجل غش میں پڑی تھی
بیٹھی تھی قضا کونے میں تلوار کھڑی تھی

بند ۱۲۲ مصرعے ۱، ۲، ۵، ۶

ناشاک صفت لشکرِ ملعون کو بہایا
اشجار کو کہسار کو ہاموں کو بہایا

بند ۱۲۲ مصرعہ نمبر ۱-۲

بہ خوف طوالت ان بندوں سے جن میں مرکزی استعاروں کی نمود ہے، اشارۃً ایک دو مصرعے پیشِ خدمت ہیں :-

اک ضرب سے دو ٹکڑے زرِ قلب بدن تھا
عباس کے قبضہ میں یداللہ کا چلن تھا
بند ۱۲۴، مصرعے ۵، ۶

یا

باراں یہ پکارا کہ حذر تیغِ مبیں سے
سر مردوں کے گردوں پہ برستے ہیں زمیں سے
بند ۱۲۵، مصرعے ۵، ۶

پانی اور جناب عباس کا رشتہ، اور موتی کا رشتہ، تلوار سے آب کا رشتہ، اور آب سے موتی کا رشتہ مذکورہ بالا بند اور اشعار اور مندرجہ ذیل اشعار میں جس خوبی سے نظم کیا ہے وہ بذاتِ خود انتہائے کمال ہے۔

یہ آبِ دمِ تیغ نہ ٹھہرا کسی شئے میں
نشہ کی طرح دوڑ گیا ہر رگ و پے میں
بند ۱۲۶، مصرعے ۳، ۴

تلوار پانی اور لب کا رشتہ

تحسین لبِ لشکرِ سفاک سے نکلی
مغفر میں چھپی سینۂ ناپاک سے نکلی
بند ۱۲۷، مصرعے ۳، ۴

تلوار اور آب کا رشتہ

بجلی نے پڑھا تیغِ علمدار کا کلمہ
بند ۱۲۸، مصرع ۶۔

تلوار اور موتی دونوں استعارے پھر یکجا ہوئے ہیں

شمشیرِ خدا تیغ بکف نہر پہ آیا
اس درِ نجف کا جو پڑا فوج پہ سایہ
دریا گہرِ صاف کے پانی میں نہایا
انگلی سے جو تھے کا عرق پاک کیا تھا
دریا کا شکم موتیوں سے پاٹ دیا تھا
بند ۱۲۳، مصرعے ۲ تا ۶

اور اب ان موتیوں کی حقیقت بھی ملاحظہ ہو :-

پر پیاسوں کی تقدیر میں ہے خشک زبانی
اور تقدیر میں اک بوند بھی پانی کی نہیں ہے
بند ۱۲۳، مصرعے ۳-۶

یا دریا سے عجب آن بنائے ہوئے نکلے | بند ۱۳۵ مصرع ۱-۳
مشکیزے کو کاندھے سے لگائے ہوئے نکلے

اور بعد شہادتِ جناب عباس، امام مظلوم فرماتے ہیں:-

پانی کا بھی ہم کو نہیں مقدور ہے زینب بند ۱۵۴ مصرع ۶

اور ایک ننھی بچی کی آواز ابھرتی ہے۔

منگوایا تھا پانی یہ بڑی میں نے خطا کی بند ۱۵۷ مصرع ۵

ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی

پروفیسر سیّد احتشام حسین: کچھ یادیں کچھ غم

پروفیسر سیّد احتشام حسین رضوی ماہلی کے انتقال کو پندرہ سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے لیکن نہ جانے کیوں آج بھی انھیں "مرحوم" کہہ کر پکارنے کو جی نہیں چاہتا ——— اُن کی پہلو دار شخصیت کے آب و رنگ، اُن کی گفتگو کی سحر انگیزی، اُن کی تحریروں میں چھپی ہوئی گہری علمیت، اُن کے پختہ سماجی شعور، ان کے معتدل اور منطقی ترقی پسند نظریات، اُن کا اعلیٰ ذوق مطالعہ، اُن کی صحت مند قوت مشاہدہ اور ہر انسان کے لیے اُن کے دل میں پائی جانے والی پُر خلوص دردمندی۔ یہ ایسی خصوصیات ہیں جن کے نقوش کو یادوں کے نہاں خانوں سے کھرچ کر مٹا دینا کم از کم میرے بس میں نہیں ہے۔

احتشام صاحب کی تاریخ رحلت یکم دسمبر ۱۹۷۲ء ہے۔ اُن کے انتقال کے بعد اُردو کے بہت سے ادبی رسائل نے اُن کی یاد میں خصوصی نمبر شائع کئے تھے۔ فروغ اُردو (لکھنؤ) کا "احتشام حسین نمبر" اپنی جامعیت اور حُسنِ ترتیب کی بنا پر دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نمبر میں راقم الحروف نے بھی ایک تاثراتی مضمون لکھا تھا جس کا اعادہ یہاں غیر ضروری سا ہے لیکن محترم مدیر "ادبی کائنات" کے ارشاد کی تعمیل میں اپنی زیر تسوید کتاب "میرا زمانہ" سے چند صفحات یہاں پیش کر رہا ہوں۔ ممکن ہے قارئین کو پسند آئیں۔

احتشام حسین صاحب ۲۱ اپریل ۱۹۱۲ء کو ضلع اعظم گڑھ (یو۔پی) کے قصبہ ماہُل سے آٹھ میل دور بمقام اترڈیہہ پیدا ہوئے تھے۔ سرکاری کاغذات میں اُن کی تاریخ ولادت ۱۱ جولائی ۱۹۱۲ء ہے جو غلط ہے[1] اس گاؤں سے احتشام صاحب کو دلی محبت تھی چنانچہ جب وہ ۱۹۵۲ء میں راک فیلر فاؤنڈیشن کی دعوت پر امریکہ جانے لگے تو اس گاؤں کے بھولے بھالے بامروّت اور پُر خلوص لوگوں نے اپنی گدڑی کے اس

---

[1] بحوالہ مکتوب احتشام حسین صاحب بنام جناب باقر مہدی مطبوعہ ماہنامہ نقش کوکن بمبئی (پروفیسر احتشام نمبر) جولائی ۱۹۷۳ء ص ۷۔

لعل کو شہر سے بلا کر اس کے اعزاز میں الوداعی جلسہ منعقد کیا تھا۔
جلسہ کی روداد خود احتشام صاحب کے الفاظ میں سنئے:

"پاسپورٹ نجانے کس منزل میں تھا کہ میں تین دن کی رخصت لے کر عزیزوں سے ملنے کے لئے وطن چل دیا۔ ماہُل، اعظم گڈھ کے ضلع میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو میرے بچپن میں بہت بارونق معلوم ہوتا تھا لیکن اب اُجاڑ سا نظر آتا ہے تاہم اس ویرانے سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں جن کا بدل کوئی اور زندگی، زندگی کی کوئی پُرمسرت گھڑی نہیں ہوسکتی ـــ اب بہت کم وہاں جانا ہوتا ہے لیکن اب بھی وہاں جانا اتنی ہی آسودگی بخشتا ہے جتنی ماں کی محبت بھری آغوش۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ میرے "اعزاز" میں گاؤں کی پنچایت کا جلسہ ہوگا، مجھے ایڈریس پیش کیا جائے گا اور بچوں کو مٹھائیاں تقسیم ہوں گی! آخر کیوں؟ میں نے کون سی جنگ فتح کی ہے؟ کون سی عزت حاصل کی ہے؟ کچھ نہیں ـــ پنچائیت کا فیصلہ ہے کہ یہ سب کچھ ہوگا۔ میرا بچپن کا ساتھی اور عزیز دوست فصیح پنچایت کا صدر ہے، میں جانتا ہوں کہ اس میں اسی کا ہاتھ ہے۔ اسے رنجیدہ نہیں کرسکتا تھا ہر طرف ایسی آمادگی تھی کہ سر جھکا دینے کے سوا میرے لیے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ دوستوں، عزیزوں اور ہم وطنوں کی یہی خواہش تھی۔ مجھے خاموش ہوجانا پڑا، میں نہیں جانتا تھا کہ یہ لمحہ میرے لیے زبردست جذباتی آزمائش کا لمحہ ثابت ہوگا ورنہ اس کے لیے کبھی آمادہ نہ ہوتا۔ ہوتا بھی تو سوچ سمجھ کر۔

جلسہ ہوا اور پرائمری اسکول کی اس عمارت میں ہوا جس کی گرد میرے جسم میں پیوست ہوچکی ہے۔ سامنے ایک بڑا مجمع تھا جس میں سب ہی تھے۔ ہندو مسلمان، برہمن اور اچھوت، سید اور چمار، چھوٹے اور بڑے۔ کچھ جنھیں میں پہچانتا تھا، کچھ جن سے ناواقف تھا، سبھوں کی آنکھوں میں حیرت اور مسرت کی جھلک تھی۔ پھول اچھل رہے تھے، باجے بج رہے تھے، بچے تالیاں بجا رہے تھے کہ ایڈریس پڑھا گیا۔ بہت ہی محبت آمیز اور فخر انگیز جملے تھے۔ اور مجھے جواب دینا تھا۔ میں نے بہت سے مجمعوں کے سامنے تقریریں کی ہیں لیکن مجھ پر یہ کیفیت کبھی طاری نہیں ہوئی۔ کچھ کہنا چاہتا تھا اور کہہ نہ سکتا تھا۔ میرا گلا ندھ گیا اور چہرہ آنسوؤں سے تر ہوگیا۔ ایک منٹ، دو منٹ، تین منٹ، اور میرے منھ سے آواز نہ نکلی، نہ جانے کہاں کی یادیں اُبل پڑی تھیں، سامنے بوڑھے پنڈت جی بیٹھے مجھے دیکھ رہے تھے جنھوں نے اسی اسکول میں کبھی مجھے پڑھایا تھا۔

بوڑھوں کے بے رونق اور فاقہ زدہ چہرے تھے، میلے کچیلے لباس میں کمزور اور لاغر بچے تھے، حیرت سے کھلی ہوئی سیکڑوں آنکھیں تھیں اور میرا ذہن ہزاروں تصویریں بنا بنا کر مٹا رہا تھا۔ میرے لیے یہ محبت کیوں ہے؟ میں نے اس گاؤں کے لیے، اپنے اس وطن کے لیے کیا کیا ہے، میں کیا کرسکتا ہوں؟ یہ محبت مجھ پر قرض رہے گی۔ مجھے یونیورسٹی کی کرسی، راک فیلر فاؤنڈیشن سے ملا ہوا اعزاز، رسالوں میں چھپی ہوئی تعریفیں سب اس بے پناہ اور پُرخلوص محبت کے سامنے ہیچ نظر آرہی تھیں۔ اتنے میں کسی نے میرے قریب ہی ٹھنڈی سانس بھر کر میرے والد مرحوم کا نام لیا اور کہا۔ کاش وہ زندہ ہوتے! میرے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی اور ہچکیاں گلے میں پھنسنے لگیں سخت آزمائش تھی اور میں بالکل طوفان کی زد پر کھڑا تھا۔ شاید کوئی میری تنگ ظرفی پر ہنسے لیکن مجھے کوئی پروا نہیں، یہ اعزاز، محبت کی یہ سند جسے مل جائے اُسے کچھ اور نہیں چاہیے! محبت کے آنسوؤں کے سوا کوئی چیز اس کی قیمت قرار نہیں پاسکتی، میں نے کسی طرح مختصر سی تقریر کی، جلسہ ختم ہوا۔[1]

احتشام صاحب خلوص کے بھوکے اور محبت کے پیاسے تو تھے ہی، حد درجہ خوش اخلاق بھی واقع ہوئے تھے، اُن کی خوش اخلاقی کے بارے میں بہت سی کہانیاں سننے میں آتی ہیں۔ احتشام صاحب، کے ہم زلف، اُردو کے منفرد شاعر، حضرت شمیم کرہانی (مرحوم) کے خونِ دل سے لکھے ہوئے یہ بند ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے ؎

انسانیت کا چاہنے والا کہاں گیا — شان ادب بھی جس سے دوبالا کہاں گیا
گنگا کے ساحلوں کا اُجالا کہاں گیا — دھرتی اُداس ہے کہ ہمالا کہاں گیا

دُنیا نگاہ و نقد کی تاراج ہو گئی
غمگیں ہے فکر ہند کہ بے تاج ہو گئی

جو افتخار نوعِ بشر تھا، وہ احتشام — جو ناقد علوم و خبر تھا، وہ احتشام
جو مایہ دار فکر و نظر تھا وہ احتشام — جو تیشہ کار و آئینہ گر تھا، وہ احتشام

جس کے قلم پہ ظلمتِ شب ٹوٹتی رہی
لیکن قلم سے فن کی کرن پھوٹتی رہی

چارہ تھا رنج و درد غریباں کے واسطے — مرہم تھا زخم قلب یتیماں کے واسطے
صبح وطن تھا شام غریباں کے واسطے — اک نعمتِ عظیم تھا انساں کے واسطے

---

[1] ساحل اور سمندر۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۵۴ء ص ۲۹ — ۳۱۔

صبح زمیں نواز کی ضَو تھی سرشت میں
دِل تھا کہ جیسے پھول کِھلا ہو بہشت میں
عِلم و اَدب کا رُعب جماتا نہ تھا کبھی   دَولت کی آب و تاب دکھاتا نہ تھا کبھی
فانوس و گل سے گھر کو سجاتا نہ تھا کبھی   احسان کرکے، سب کو بتاتا نہ تھا کبھی
کِتنا بلند ظرف تھا۔ عالی وقار تھا
سرمایہ دار فن تھا۔ مگر خاکسار تھا   (جانِ برادر)

احتشام صاحب کے صاحبزادے جناب جعفر عسکری صاحب کا بیان ہے:

"دوسروں کی خوشی کے لیے تمام عمر والد صاحب کیسی کیسی تکلیفیں اُٹھاتے رہے، ایسے واقعات تو بارہا ان کی زندگی میں پیش ہوتے رہے، جب دوسروں کی خوشی کے لیے انھیں مختلف قسم کی پریشانیوں میں مُبتلا ہونا پڑا اور وہ خاموشی سے یہ سب کچھ برداشت کرتے رہے۔ بہت سا لکھنے پڑھنے کا اُن کا وقت اِن فضولیات کی نذر ہو جاتا تھا، لیکن والد صاحب کبھی اس سلسلے میں اپنی زبان پر ایک حرف بھی نہ لائے۔" [1]

لاریب، دوسروں کی خوشی کے لیے اپنے وقت، صلاحیتوں اور طاقت کا خون کرنا لائق تحسین بات ہے لیکن قابلِ عبرت بھی ہے، اُن حضرات کے لیے جو اپنی کم فہمی، خود غرضی یا قدر ناشناسی کی وجہ سے ایسے عہد آفریں اور بیش بہا انسانوں کی زندگی کو برباد کر دیتے ہیں۔

بہر حال، مقامِ شکر ہے کہ احتشام صاحب سے "مکمل مُرغی خانہ" اور "اصولِ باغبانی" جیسی کتابوں پر مقدمہ لکھوانے والے ستم ظریفوں کی فوج کے ساتھ ساتھ اُن کے بہت سے بے غرض، مخلص اور سچّے قدر دان اور بے لوث عقیدت مند بھی تھے جو اُن کے حُسنِ اخلاق اور علم و فضل کا ذکر کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکے مثلاً:

"احتشام صاحب میرے بیٹے تھے، میرے شاگرد تھے۔ وہ میرے اُن شاگردوں میں تھے جن کو کئی ہزار برس کی زندگی پاکر بھی میں آخرِ دم تک نہیں بھول سکتا۔ اپنے اس لائق شاگرد کے اُٹھ جانے سے میں خود یتیم ہوگیا۔ احتشام اتنے اچھے آدمی تھے کہ کم از کم مجھے ان پر کئی موقعوں پر غصہ آجاتا تھا کسی کے خلاف صحیح یا مناسب بات بھی کہنے کی ہو تو وہ ایسی بات کہتے ہی نہ تھے۔ احتشام صاحب

---

[1] شاہکار۔ احتشام نمبر مضمون: (زندہ اور روشناس خلق) ص ۶۹

میں سادگی بڑی پاکیزہ صورت اختیار کر گئی تھی۔" [۱]

"اظہارِ خیال میں متانت سے کام لیتے۔ رائے میں تحریر یا نمائش کا شائبہ بھی نہ آنے دیتے لیکن انکسار و عجز کا اتنا اثر بھی نہ آنے دیتے کہ ان کی انفرادیت نہ محسوس ہو سکے۔ ان کی ذہنی گرفت کی وسعت بھی اثنائے گفتگو ظاہر ہوتی اور مصنف کی اہمیت بھی نمایاں ہوتی درمیان درمیان مضمون یا خیال کی مختصر الفاظ میں تعریف یا تنقیص بھی کرتے اور اپنے جذبات کا بھی چند لفظوں میں ذکر کرتے۔ ان باتوں سے مجھے اُن سے انسیت روز بروز بڑھتی گئی۔ ہم دونوں کی قدر ایک دوسرے کے دلوں میں جگہ پاتی رہی"۔ [۲]

"احتشام صاحب بہت اچھے رفیق تھے کسی کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے۔ کسی سے اختلاف ہوتا تو اکثر خاموش رہتے۔ کسی کا کوئی ذاتی مسئلہ ہوتا تو اس کے حل کرنے میں ہر ممکن کوشش کرتے، تعلّی اُن کو چھو تک نہیں گئی تھی۔ اپنے سے سینئر لوگوں سے ہمیشہ ادب اور احترام سے ملتے تھے چھوٹوں سے شفقت سے پیش آتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ احتشام صاحب سے کسی کا جھگڑا ہوا ہو یا تلخ کلامی کی نوبت آئی ہو"۔ [۳]

"انھیں اپنے شاگردوں سے بڑی محبت تھی۔ ان کی ذاتی اُلجھنوں میں وہ خود شریک ہو جاتے، مشورے دیتے، گفتگو کرتے، بار بار پوچھتے کہ کون کس حال میں ہے، کیا لکھ رہا ہے، کیا پڑھ رہا ہے، کیسے دن گزارتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اپنے شاگردوں ہی کی نذر کر دیا۔ جو کچھ سیکھا تھا اس کے عشر عشیر کا بھی اظہار نہ ہو پایا مگر جو کچھ ہوا وہ ان کی تحریروں سے زیادہ ان کے کلاس روم لکچروں میں ہوا"۔ [۴]

---

[۱] فراق گورکھپوری (مضمون: خلوص سراپا) شاہکار احتشام نمبر ص ۴۷

[۲] ڈاکٹر سید اعجاز حسین (مضمون: ذہن و کردار کی ابتدائی نشو و نما) ایضاً ص ۸۵

[۳] پروفیسر آل احمد سرور (مضمون، کچھ یادیں کچھ تصویریں) شاہ کار احتشام نمبر ص ۹۷

[۴] ڈاکٹر محمد حسن (مضمون: تزکِ احتشام) نیا دور لکھنؤ احتشام نمبر ص ۴۶

"احتشام حسین اپنی زندگی کے آخری دن تک ترقی پسند ادب کی تحریک سے منسلک ہی نہیں رہے، اُنھوں نے اپنی گراں بہا تحریروں سے اس تحریک میں معنویت، گہرائی، ہمہ گیری اور وسعت پیدا کی .... اور آج جب احتشام دامن جھاڑ کر اس دنیا سے اُٹھ گئے ہیں ہم فخر اور اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی تحریر کا ایک ایک لفظ جب تک صفحۂ قرطاس پر سچے موتیوں کی طرح چمکتا رہے گا۔ وہ ہمیں اور ہمارے بعد آنے والوں کو اس تحریک کو نئی جہتوں میں لے جانے اور حقائق اور اسالیب کی جستجو اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق نئی فکر اور نئی تخلیقی کاوشں کے لیے آمادہ کرتا رہے گا۔" [۱]

عام طور پر لوگ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ایک ترقی پسند انسان لازمی طور پر مذہب سے دُور بھاگتا ہے۔ بقول ساحر لدھیانوی [۵]

عقائد وہم ہیں ، مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی

لیکن احتشام صاحب نے عملاً اس مفروضہ کو مہمل ثابت کر دیا۔ انھیں مذہبی محافل و مجالس میں بھی شریک دیکھا گیا۔ یہ اُن کی میانہ روی، طبیعت کے ٹھہراؤ اور معقولیت کی دلیل ہے۔ غالباً ۱۹۴۹ء میں، میں نے احتشام صاحب کو پہلے پہل اُس وقت دیکھا تھا، جب وہ شہر بمبئی کی امامیہ مسجد میں ایک مجلس عزائے حسین میں رونق افروز منبر تھے۔ اُن کے اُستاد ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب (مرحوم) راوی ہیں :۔

"مجالس عزا چاہے اور کسی لحاظ سے کار آمد ہوں یا نہ ہوں مگر تاریخی معلومات وادبی دلچسپیوں کی محرک ضرور ہوتی ہیں ...... چنانچہ اُنھوں نے نوحہ خوانی میں بھی حصہ لیا۔ اور ذاکروں کی تقریروں سے مواد جمع کر کے ذاکر کی حیثیت سے کبھی کبھار بر سر منبر واقعات کربلا بھی بیان کرنے لگے ...... احتشام کی تقریر بھی ترقی کرتی رہی . قوت گویائی نشو و نما پاتی رہی' سامعین سے آنکھیں ملا کر دو بدو گفتگو کی صلاحیت روز افزوں اُجاگر ہوتی گئی۔ لیکن یہ سارا ماحول ان کو آگے نہ بڑھا سکتا اگر اُن کے ضمیر کی بھی آواز نہ شاملِ حال ہوتی۔" [۷]

احتشام صاحب کی "مذہبیت" اُن کی زندگی کے ابتدائی دور میں بھی تھی اور آخر عمر میں بھی۔ ثبوت میں وہ مختصر مضامین

---

[۱] سید سجاد ظہیر (مضمون : ترقی پسند تحریک کا معمار) شاہ کار ص ۲۴۷

[۷] (مضمون : ذہن و کردار کی ابتدائی نشو و نما) مطبوعہ شاہ کار احتشام حسین نمبر ص ۸۷

پیش کئے جا سکتے ہیں جو مرحوم نے سرفراز، الواعظ، الجواد، نظارہ، شیعہ اور بہت سے دوسرے رسائل وجرائد کے لیے وقتاً فوقتاً لکھے یا اُن کے قلم سے نکلا ہوا یہ جملہ ملاحظہ فرمایئے :-

"ابھی کچھ دیر پہلے جب عزیزوں کو خط لکھ رہا تھا تو خیال آیا کہ آج وہاں (ہندوستان میں) محرّم کی پہلی تاریخ ہوگی اور میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔" [1]

آج سے تقریباً ۲۸ ——— ۲۹ برس پہلے انجمن نوجوان مصنفین (بمبئی) کی جانب سے خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم پر ایک سلسلۂ تقاریر رکھا گیا تھا۔ جس میں پروفیسر احتشام صاحب نے حالی کی حیات اور ادبی خدمات پر چھ لکچر دئے تھے [2] جو قدرے ترمیم و تنسیخ کے ساتھ مضامین کی شکل میں بھی شائع ہوئے)۔ اس سلسلۂ خطبات کے دوسرے دن جب وہ بجائے شیروانی، بڑی مُہری کے پاجامے اور ٹوپی کے، ہلکے سلیٹی رنگ کے سوٹ میں ملبوث تھے، اُن کا لباس اُن کے جسم پر پھوٹ پھوٹ کے کِھل رہا تھا اور زبان حال سے ان کی "جامہ زیبی" کا قصیدہ پڑھ رہا تھا اُنھوں نے اپنی تقریر کی ابتدا اس جملہ سے کی کہ ——— انسان کی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز ہوتے ہیں : ناکامیوں کے نشیب اور کامیابیوں کے فراز۔ اپنی بات کی وضاحت کے لیے وہ پیچھے مڑے تاکہ تختۂ سیاہ پر شکل بنا کر سامعین کو سمجھا سکیں، لیکن وہ یونیورسٹی کا لکچر روم تو تھا نہیں، کریمی لائبریری کا ہال تھا، لہٰذا چند لمحوں کو وہ مایوس سے ہوگئے۔ اصولاً توسیعی خطبات کے موقع پر یعنی بلیک بورڈ، چاک اور ڈسٹر کا موجود رہنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یہ منتظمین جلسہ کی کوتاہی اور فروگذاشت تھی۔

بہر نوع پروفیسر احتشام صاحب نے فرمایا کہ کسی کی سوانح عمری پڑھتے وقت ہمیں محض اس کی فتوحات، کامیابیوں یا بہ الفاظ دیگر فرازوں پر ہی نظر نہ ڈالنی چاہیے بلکہ ایک ہوشمند طالب علم نشیبوں پر بھی نگاہ رکھتا ہے۔

احتشام صاحب، بمبئی کے ایک شاندار ہوٹل میں ٹھیرائے گئے تھے جس کا نام اُس وقت "دار الحبیب" تھا۔ یہ ہوٹل نریمان پوائنٹ (مرین ڈرائیو) کے پاس واقع تھا۔ تیسرے دن، تقریر کے بعد، ایک گوشے میں لے جا کر میں نے احتشام صاحب سے کہا کہ آپ کو پیچش کی تکلیف اکثر رہا کرتی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو غریب خانہ پر کھانا نوش فرمالیں یا پھر میں ہر روز کھانا ہوٹل تک پہنچا دیا کروں۔ وہ مسکرا کر بولے۔ ارے بھئی، اس کی کیا ضرورت ہے۔ اوّل تو خدا کا شکر ہے آج کل میرا ہاضمہ ٹھیک ہے، دوسرے آپ کیوں زحمت کریں

---

[1] ساحل اور سمندر (پہلا ایڈیشن، ۱۹۵۴ء) ص ۱۱۱

[2] یہ خطبات کریمی لائبریری ہال انجمن اسلام ہائی اسکول ڈی این روڈ بمبئی ۱ میں دیے گئے تھے۔

میرے رشتہ کے بھائی جناب سبطِ حسن صاحب خیالؔ اور بھانجے شبیہ عباس سلمہ نے بھی یہی کہا تھا جو آپ کہہ رہے ہیں، مگر انھیں بھی میں نے یہی جواب دیا تھا۔ اس کے بعد انجمن اسلام ہائی اسکول سے ٹیکسی میں حضرت کیفی اعظمی، محبی سید عبدالقوی دسنوی، محبی سلیمان ظفر اور راقم الحروف اُن کے ساتھ دار الحبیب تک گئے تھے۔

احتشام صاحب نے بہ اصرار ہم لوگوں کو چائے پلائی۔ برادرم جناب باقر مہدی صاحب بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ ہم لوگوں کی بار بار درخواست پر احتشام صاحب نے اپنے لیے کھانا منگوایا اور بہت شرما شرما کر کھایا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ دیکھئے حسینی صاحب! کتنا لائٹ کھانا ہے۔ اسے پرہیزی کھانا ہی سمجھیے۔ کھانے میں برطانیہ بریڈ، دہی، کسی چیز کی سبزی اور سلاد تھا۔ ایک پیالی میں دال تھی اور پلیٹ میں تھوڑے سے چاول۔ اتنا کھانا ایک خوش خوراک اور تندرست انسان کے لیے مقدار کے لحاظ سے یقیناً کم تھا۔

کچھ ہی دیر بعد جناب اعجاز صدیقی مدیر ماہنامہ شاعر (بمبئی) اور جناب سید علی رضا صاحب (فلم رائٹر و ڈائرکٹر) آگئے اور ہم سب لوگ اجازت لے کر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

تقریری سلسلہ ختم ہونے کے بعد ہم سب بمبئی والوں نے وی، ٹی اسٹیشن پر احتشام صاحب کو خدا حافظ کہا۔ وہ فرداً فرداً بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ سب سے ہاتھ ملاتے رہے اور شکریہ ادا کرتے رہے۔ گاڑی چھوٹنے سے پانچ منٹ قبل وہ ہوڑہ بمبئی میل کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں چڑھ گئے۔ دروازے کے پاس کھڑے ہو کر ایک بار پھر ہاتھ ہلایا اور نہایت سنجیدگی سے اندر جا کر اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔
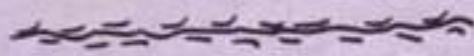
اُردو کے مشہور ادیب، مستند نقاد اور معتبر دانشور جنکو مارکسی دبستان ادب و تنقید سے وابستگی کے حوالے سے خاص شہرت دی گئی۔ بہت کم ایسے صاحب اطلاع ہوں گے جو اس طرف متوجہ ہوں کہ ان کی تحریروں کی متانت اور گہرائی کے پیچھے ان کی بہترین مذہبی فکر کی بھی کارفرمائی تھی۔

اگر احتشام حسین مرحوم کے مذہبی مضامین اور منظومات کو یکجا کر کے شائع کر دیا جائے تو اُردو میں اچھے مذہبی مضامین کا ایک ذخیرہ مرتب طور پر محفوظ ہو جائے گا اور خود احتشام حسین کے فکری ابعاد پر مزید روشنی بھی پڑے گی۔

(ادبی کائنات محرم الحرام ۱۴۰۹ھ / ستمبر ۱۹۸۸ء صہ ۲)

مجاہد حسین

سلام گوئی، اور قاسم شبیر نصیر آبادی

انسان کو اشرفیت بخشنے کے لیے قدرت نے اسے جن امتیازات سے نوازا ہے ان میں قوتِ فکر و نظر، تمیز نیک و بد، تقریر و تحریر اور شعورِ معاشرت و تمدن نمایاں ترین امتیازات ہیں لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ ہر انسان اشرفیت کے یکساں معیار اور مرتبہ پر فائز نہیں ہے۔ اس بحث سے سروکار نہیں کہ اس کے پس پردہ کن عوامل کی کارفرمائی ہے، ہمیں تو محض یہ دیکھنا ہے کہ بعض انسان تمام مخلوقِ الٰہی میں اشرفیت کے اس بلند مرتبہ پر ہوتے ہیں کہ ان کی بزرگی کا عرفان خود انہیں بھی ہوتا ہے اور دوسرے بھی اس عرفان میں ان کے شریک ہوتے ہیں یا ہونے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور ـــ موانست، محبت، عشق، مودت، عقیدت اور اعتقاد وغیرہ کی قدریں تشکیل پاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ تمہید اُردو شاعری کی صنفِ "سلام" کو سمجھنے میں معاون ہوگی۔

"سلام" عربی زبان کی لفظ ہے اور آدابِ معاشرت میں ایک رسمِ مسنون! لیکن عربی شاعری میں ایک جداگانہ صنفِ شعر کی حیثیت سے اس کا وجود نہیں تھا۔ فارسی میں البتہ ہے، لیکن کچھ زیادہ وقیع نہیں ہے۔ اُردو شاعری میں "مرثیہ" کی طرح "سلام" کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں سلام گوئی کی ایک مستقل اور مستحکم روایت ہے۔ اگرچہ اس صنف شاعری کی تنقیدی ارزیابی تقریباً نہیں ہوئی ہے۔ اور اسی لیے بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سلام اور غزل کی صنفیں مشترکہ ہیئتی اور معنوی اقدار کی حامل ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں کا تشکیلی مزاج اور آہنگ مختلف ہے۔ غزل کے تشکیلی مزاج میں عشق کو بالادستی ہے اور سلام کے تشکیلی مزاج میں عقیدت کو۔

لیکن سچ پوچھیے تو دل میں عقیدت و اعتقاد رکھنے کے باوجود سلام گوئی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ بقولِ مشیر لکھنوی مرحوم ؎

غزل کا شعر کہیں اور سلام کہلائیں
مشیر کیا کہیں ان احمق الذہنوں کو

ہمارے عہد میں اس صنف میں قاسم شبیر نقوی نصیر آبادی کو واقعتہً کمال حاصل ہوا ہے جنھیں دسمبر ۱۹۸۳ء میں ان کی مجموعی ادبی وشعری خدمات اور بالخصوص "بہترین مذہبی شاعری" پر "شاعر سفینہ" کا اعزازی تمغہ اور "سفینہ شعری انعام" پیش کیا گیا تھا۔

قاسم شبیر کا امتیاز یہ ہے کہ ان کے یہاں غزل غزل رہتی ہے اور سلام سلام رہتا ہے۔ ان کے کہے ہوئے سلام بنیادی طور پر عقیدتی اور اعتقادی فضا کے حامل نظر آتے ہیں۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

ذکرِ شبیر بناتا ہے سخن ور کتنے | اَدَب و شعر کو مل جاتے ہیں جوہر کتنے
تُو نے دُنیا میں سنوارے ہیں مقدر کتنے | اپنے قاسم کی بھی قسمت پہ نظر کر مولا

جہاں جہاں بھی کوئی راہِ مشکلات ملی | علیؑ کا نام لیا اور گزر گیا قاسم

قاسم شبیر اپنے سلاموں میں ادبی عناصر اور خصوصی شعری محاسن کی طرف خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ مثلاً:

تھی دسترس بھی تو پیاسا چلا گیا عباسؑ
وفا کی تھاہ لگاتا رہا فرات کا دِل

اس شعر میں حسنِ زبان اور اظہار کے لفظی امکان کا لطف قابلِ لحاظ ہے۔ دسترس، تھاہ اور فرات کا دل ایسے ٹکڑے ہیں جنہیں معانی کا سمندر کہا جاسکتا ہے۔ جن میں حضرت عباس علیہ السلام کی شجاعت، ان کے اقتدار، ان کے صبر وضبط، ایثار وقربانی کے جذبے اور بے مثل وفا، کی پوری شرح مکمل ایجاز کے ساتھ موجود ہے ساتھ ہی قلبِ فرات کی پشیمانی، حیرت اور وفائے عباس کے سامنے اُس کا احساسِ کمتری۔

قاسم نے اپنے سلاموں ہی میں معاملاتِ ذہنیہ اور وارداتِ قلبیہ کے اظہار کا التزام بھی رکھا ہے۔ جس کے سبب اُن کے یہاں نہ مضامین میں تنوع کی کمی محسوس ہوتی ہے نہ بیان میں یک رنگی رہتی ہے۔ یہاں پر بیجا نہ ہوگا اگر ان کے متعلق مولانا عقیل الغروی مدظلہٗ کی ایک رائے نقل کر دی جائے کہ:

"قاسم شبیر نقوی نصیر آبادی کا فکری اور فنی سرمایہ خاصا بھرپور توانا اور وقیع ہے۔ اگرچہ ان کے غیر مذہبی (خالص ادبی) کلام کی اشاعت نسبتاً بہت کم ہوئی۔ تاہم خالص ادبی اور شعری اقدار کی توسیع اور تحفظ میں ان کی پُراثر شخصیت کا کردار بھی اہم ہے۔"

"خود قاسم کا اعتراف ہے کہ انھوں نے میر، مصحفی، انیس، یگانہ، فانی، حسرت، اثر، آرزو، جوش اور جمیل مظہری کے اثرات قبول کیے ہیں۔ ماسوا جوش کے سبھی میں کلچر کی یکسانیت

کے علاوہ "رنج والم" "خلوصِ وفا" اور "نیاز ولا" کی جو معرفت آگیں اقدار ہیں۔ قاسم کی تخلیقی توانائیاں بھی وہی ہیں۔ لیکن قاسم نے اپنا ایک ممیز لب ولہجہ بھی بنایا ہے۔"[۱۰]

اسی کے ضمن میں جناب غروی مدظلہ نے ایک بات اور لکھی تھی جس کا یہاں پر نقل کرنا زیادہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ:

"غزلوں میں آثارِ کربلا" کی اثر آفرینی سمو دینے والے شاعر کے سلسلے میں گفتگو "غزل" سے "سلام" تک پہنچ جائے تو کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ قاسم جس طرح غزل میں مکمل دستگاہ رکھتے ہیں "رثائی اصنافِ سخن" میں سلام، نوحہ، رثائی قطعات، مرثیہ اور دوسری طرف قصیدہ اور مدحیہ منظومات غرض ہر صنفِ سخن میں انھوں نے بیش قیمت اضافہ کیا ہے۔"[۱۱]

——— غور کیجیے تو واقعتہً قاسم شبیر کے سلام فنی محاسن کا گلدستہ نظر آتے ہیں۔ بطورِ مثال چند شعر سادہ طور پر ملاحظہ فرمائیں اور چند شعر بعض صنائع کے اعتبار سے:

نہ جانے کوئی صدی تھی کہ روزِ عاشورہ
زمانہ بن گیا اک مختصر زمانے میں

حسینیت تو ہے محفوظ ہر خزانے میں
یزید کا کوئی سکہ نہیں زمانے میں

صنعتِ ردالعجز علی الصدر:

راہِ حق ملتی کہاں ہے راہِ ناہموار سے
ربط ہو سکتا نہیں دنیا میں نور و نار سے

صنعتِ تلمیح:

ڈر گئی دنیائے باطل ہل گیا قصرِ یزید
ایک پردہ دار عورت اور ایک بیمار سے

سلام گوئی کے لیے قاسم شبیر، مضامین کے در و بست، بندشوں کی چستی اور شگفتگی وغیرہ کے ساتھ زمینوں کے انتخاب میں بھی جدت طرازی اور انفرادیت سے کام لینے کی کوئی کسی باقی نہیں رکھتے۔ افسوس ہے کہ یہاں ان کے کلام کے تفصیلی مطالعہ کی اور زیادہ سے زیادہ مثالیں پیش کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ ایک جگہ قاسم شبیر نے

خدائے سخن میر تقی میرؔ کی ایک مشہور غزل کے مصرعوں پر سلام کے مصرعے لگاکر معجز بیانی کا ایک سماں باندھنے کی کوشش کی ہے۔ ہم یہاں اسی کو پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں ؎

اک نور احمدیؐ کا اثر دُور دُور تھا — تھا مستعار حُسن سے اُس کے جو نُور تھا
نفسِ رسولؐ پاک میں اس درجہ نُور تھا — خورشید میں بھی اُس کا ہی ذرّہ ظہور تھا
روکا ہر اک کو قوّتِ صبرِ امام نے — ہنگامہ گرم کُن جو دلِ ناصبور تھا
کوفے میں کو بہ کو تھا غمِ شاہ صابریں — پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا
نیت کو حُر کی جانتے تھے شاہ عیب پوش — اس شوخ کو بھی راہ پر لانا ضرور تھا
کیسے اُٹھاتے بھائی کے لاشے کو شاہِ دیں — یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہتا پھرے ہے کاسۂ سر یوں یزیدؑ کا — میں بھی کبھی کسی کا سرِ پُر غرور تھا
حق کی کھلی کتاب تھی سیرت حسینؑ کی — سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا
جب تک نہیں تھا ذکرِ رُخِ آفتابِ دیں — کیا شمع، کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا
بولے حبیب آئے جو قدموں میں شاہ کے — معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دُور تھا

قاسم شبیر کے سلاموں اور رثائی نظموں کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں جنہیں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی ہے لیکن حال ہی ماورائے سخن" کے نام سے ان کے پچاس سلاموں کا ایک مجموعہ شاندار بکڈپو لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ اس مجموعے میں قاسم صاحب کے سلام تو بہر حال اپنے معیار کے مطابق ہیں لیکن ابتدا میں جن آرا کو توثیق کلام کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ ان میں سوائے مولانا سید کلب عابد صاحب مرحوم کی رائے کے کوئی بھی رائے ایسی نہیں جس سے قاسم شبیر صاحب کے فن یا ان کی شاعرانہ شخصیت پر کچھ روشنی پڑتی ہو بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے صاحبِ مجموعہ نے فرمائش کر کے بعض افراد سے ان کی رائے حاصل کی ہے، یہ بات بہر حال قاسم شبیر جیسے شاعر کے وقار کے منافی ہے ویسے بھی سچ تو یہ ہے "مشک آنست کہ خود ببوید نکہ عطار بگوید" بہر نوع یہ کمزوری نیز کچھ اور باتیں بھی ناقابلِ اعتذار حد تک گراں گزرتی ہیں۔ اس سے قطع نظر جناب قاسم شبیر نصیر آبادی بہر حال رثائی ادب میں اہم مقام رکھتے ہیں۔

لہ کائنات، ہدایت گڑھ نمبر، جمادی الثانی ۱۴۰۲ھ، ترتیب: ذیشان ہدانی، ص ۴۵ و ۴۶۔

مراسلات
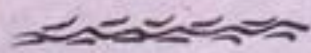
مکرمی و محترمی ۔ سلام مسنون

ادبی کائنات کا اکتوبر نومبر کا شمارہ ملا تشکر ہوں۔ رسالہ دن بہ دن وقیع ہوتا جا رہا ہے۔ خدا آپ حضرات کے جذبہ اور کاوشوں کو قبول فرمائے۔

محترم محمد صادق صاحب کے مقالہ نما مرزا دبیر کے ایک بند کی ارزیابی سے متعلق ایک گوشہ ذہن میں آیا جس کے لیے یہ چند سطور لکھ رہا ہوں صفوی صاحب محترم نے اپنے مضمون میں دو تھیسس قائم کی ہیں، پہلی تھیسس میں وہ یقیناً کامیاب رہے لیکن دوسری بات ذرا توجہ کے لائق ہے کہ "مرزا صاحب نے اپنے تین دعووں میں صرف ایک کو ثابت کیا، باقی دو ثبوت نہ ملے۔

نہ جانے کیسے صادق صاحب جیسے باخبر ادیب کے ذہن میں یہ بات آئی جبکہ مرزا دبیر نے اپنے بند میں تمام مناسبات کا نہ صرف لحاظ ہی رکھا ہے بلکہ بہترین مصرعے نکالے ہیں

عقدے کھل جائیں گے جب ہونٹ ہلا دیں گے حسینؑ

جناب موسیٰ نے اپنی زبان کی گرہ کھولنے کی دعا فرمائی تھی منجملہ دیگر دعاؤں کے جسے جناب باری نے شرف قبولیت بخشا اور وہ پھر کبھی کار تبلیغ میں لکنت میں نہ مبتلا ہوئے۔

گر کسی پیارے سے بچھڑے ہو ملا دیں گے حسینؑ

یہ مصرع اتنے بدیہی انداز میں جناب یوسفؑ کے جناب یعقوبؑ سے بچھڑنے اور پھر ملنے کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ مزید گفتگو کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔

تیسرے اور چوتھے مصرعے میں

مر گیا ہو گا جو کوئی تو جلا دیں گے حسینؑ —— جام صحت کا مریضوں کو پلا دیں گے حسینؑ

صریحاً جناب عیسیٰ کی مسیحائی کی نشاندہی کی ہے۔ اور اس کے بعد بیت ——

ایک شبیرؑ کو اللہ نے کیا کیا بخشا —— رخ یوسفؑ کف موسیٰؑ دم عیسیٰؑ بخشا

کہکر مرزا صاحب نے تمام مناسبات کو ذات شبیرؑ میں جمع کر دیا اس لیے صفوی صاحب کا یہ اشتباہ کہ

جناب موسیٰ اور جناب یوسف کے لیے مناسب مناسبات موجود نہیں ہیں محل نظر ہے اور نہ ہی مرزا صاحب کے مذکورہ بند میں کسی تصرف کی گنجائش نکلتی ہے۔ البتہ صادق صاحب کے مصرعے بھی بہت اچھے ہیں۔ بس ایک لطیف نکتہ کی طرف صادق صاحب کی نظر نہ جاسکی کہ مرزا صاحب نے جناب موسیٰؑ اور جناب یوسفؑ کی جن صفات کا ذکر کیا ہے وہ صفات ہیں جو فیض عام کی حیثیت رکھتی ہیں یعنی دوسرے ان صفات سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جبکہ کف موسیٰؑ (یا ید بیضا) اور حسن یوسف فضیلت ذاتی ہیں۔ جن کا فیض وہ خود ہی اُٹھا سکتے ہیں۔

قمر احسن دلی
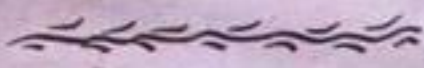
مکرمی۔

"ادبی کائنات" دیکھا، پہلے تو اتنا ننھا منا سا رسالہ دیکھ کر حیرت ہوئی، کہ ہمارے ہاں تو رسائل کی ضخامت بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن جب پڑھا تو بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے حقیقت میں دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اس میں سب کچھ ہے، جس سے ادب پڑھنے کی پیاس بجھ سکے۔ "انجام کائنات" بہت ہی خوبصورت اور معلوماتی مضمون ہے۔ اور اندازِ تحریر بھی حسین ہے۔ اسی طرح میر تقی میر پر مضمون بھی بہت خوب ہے۔

میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔ کہ آپ اتنی محنت سے اَدب کی آبیاری کر رہے ہیں۔
میرے لائق کوئی خدمت۔

شمع خالد
راولپنڈی (پاکستان)

● ادارہ "ادبی کائنات" اپنے قلمی معاونین کی خدمت میں مناسب نذرانہ پیش کرتا ہے۔ "ادبی کائنات" کے صفحات پر مقالہ نگار کو اظہار رائے کی آزادی ہے۔ اس کا اپنی ہر رائے میں ادارے کا پابند یا ادارے کا اس کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہیں۔ قلمی معاونین سے گزارش یہ ہے کہ وہ زبان کی صحت و معیار اور مواد کے استناد کا لحاظ ضرور فرمائیں!

(پرنٹر پبلشر اور پروپرائٹر سید ذیشان ہدایتی نے یونس آفسٹ پرنٹرز دریا گنج نئی دلی سے چھپوا کر مکتبہ "کائنات" ۴م، ۱م بازار مٹیا محل دلی ۶ سے شائع کیا)